

سلسلہ اشاعت تنظیم اسلامی - ۳

ڈاکٹر اسرار احمد

بانی تنظیم اسلامی

تعارف تنظیم اسلامی

بیت اسلامی تعلیم و تربیت

تنظیم اسلامی

۶۷۔ اے علامہ اقبال روڈ، گلبرگی شاہ، لاہور۔ فون: ۶۳۰۵۱۱۰

تعارف
تَظْمِیرِ اِسْلَامِی

پس منظر

اور

اساسی نظریات



نام کتابچہ _____ تعارف تنظیم اسلامی
طبع اول ہاشتم (فروری 1991ء تا دسمبر 2001ء) _____ 14,400
طبع ہفتم (دسمبر 2004ء) _____ 1100
ناشر _____ ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
مقام اشاعت _____ 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: 03-5869501
مطبع _____ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت _____ 15 روپے

ترتیب

۳	تقدیم	●
۲۵	حصہ اول	●
۲۶	قرارداد تائیس	●
۲۸	توضیحات	●
۳۶	تقریر مولانا امین آسن اصلاحی	●
۴۸	تقریر مولانا عبدالغفار حسن	●
۵۸	مولانا اصلاحی کا الوداعی خطاب	●
۶۵	حصہ دوم	●
	عقائد یا بنیادی دینی تصورات	●
۸۱	فرائض دینی کا جامع تصور	●

تقدیم

تنظیمِ اسلامی اگرچہ بحال ایک مختصر سے قافلے کی حیثیت رکھتی ہے، تاہم بحمد اللہ اس کا اجالی تعارف کسی کسی درجہ میں، نہ صرف پاکستان کے طول و عرض، بلکہ بیرونی ممالک میں بھی کم از کم آزد و بوسنے والوں کی حد تک بہت وسیع پیمانے پر ہر چمکا ہے۔ اندر کی حالات ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کے اساسی نظریات، جو بحال مختلف کتابوں کی صورت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں، انہیں افادۂ عام کے لیے یکجا کر دیا جائے۔ تاکہ ایک جانب کسی بھی نئے شخص کے لیے تنظیم کے مقاصد اور نظریات کے سمجھنے میں سہولت پیدا ہو جائے، اور دوسری جانب اُس کے اہداف و مقاصد اور بہت تنظیمی کے ضمن میں جو ارتقائی عمل بروئے کار آیا ہے وہ بھی واضح اور عین ہو جائے۔ چنانچہ یہی پیش نظر کتاب کی اشاعت کا اصل مقصد ہے۔

مختصر ترین الفاظ میں تنظیمِ اسلامی کی اجتماعی ماسی کے اہداف و مقاصد اور اس کی موجودہ دستہ تنظیمی کا جامع و مانع، تعارف مندرجہ ذیل دو جملوں کے ذریعے ہو سکتا ہے جو تنظیم کے نظامِ عمل کی پہلی دفعہ (شق ۱ اور ۵) سے ماخوذ ہیں:

۱- یہ ایک اصولی، اسلامی، انقلابی جماعت ہے جو پہلے پاکستان اور بالآخر گل روتے زمین پر اللہ کے دین کے فیلے، یعنی اسلام کے نظامِ عدل، اجتماعی کے قیام یا بالفاظِ دیگر، اسلامی انقلاب کے لیے کوشاں ہے۔

۲- اس کی تنظیمی اساس صحیح و طاعت فی المعروف کی شخصی ہیئت پر قائم ہے۔

تاہم اس کا ایک طویل پس منظر ہے، جسے دیکھتے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک؛ کے صدق پیش نظر رکھنا مفید ہی نہیں ضروری ہے!

”عظیم اسلامی“ کا ہم پہلی بار اب سے تین سال قبل اُس ہیئت تنظیمی کے ضمن میں سامنے آیا تھا جس کے قیام کا فیصلہ اُس اجتماع میں کیا گیا تھا جو ۸-۹ ستمبر ۱۹۶۶ء کو مرحوم دارغالا میں منعقد ہوا تھا، اور جس میں لگ بھگ چالیس کی تعداد میں ایسے حضرات نے شرکت کی تھی جو اکثر و بیشتر ۱۹۵۶-۵۸ء میں اور بعض بعد میں مختلف مراحل پر جماعت اسلامی پاکستان سے علیحدہ ہوتے تھے۔ اُس اجتماع میں ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم بھی شریک تھا جو علم و فضل اور تقویٰ و تدین کے اعتبار سے نو کترین تھا ہی، جہاں تک یلو پڑتا ہے عمر میں بھی سب سے کم تھا۔ — یہ دوسری بات ہے کہ اس اجتماع کا انعقاد اصلاً اسی کی تحریک و تھریں اور ڈیڑھ دو سال کی انتھک مساعی کا نتیجہ تھا۔

۱۹۵۶-۵۸ء کے دوران میں مولانا مودودی مرحوم کے جن قریب ترین رفقاء نے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ ان میں ان چاروں حضرات کے علاوہ جنہیں مولانا مرحوم کی نظر بندی کے دوران مختلف مواقع پر اہمیت جماعت کی ذمہ داری تفویض کی جاتی رہی تھی جماعت کی قیادت کی صفت و دم کا بہت بڑا حصہ شامل تھا۔ ان میں سے بعض حضرات تو اس درجہ بائوس اور دل شکستہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے نئی تشکیل و تعمیر کی کسی کوشش میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیا (جیسے مولانا عبدالغنی غازی مرحوم اور جناب سعید احمد ملک صاحب) لیکن بقیہ اکابر میں سے مولانا امین آسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، اور حکیم عبدالرحیم اشرف نے بھر پور کوشش کی کہ کوئی نئی ہیئت تنظیمی فردی طور پر وجود میں آجائے۔ ان کی اس کوشش میں جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والے اُن عام ارکان کی اکثریت بھی شریک تھی جو معتد بہ تعداد میں لاہور، لاہور (حال فیصل آباد) اور منگھری (حال ساہیوال) سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن افسوس کہ مختلف اسباب کی بنا پر یہ مساعی ناکام رہیں، اور جماعت کے سابق ارکان پر مشتمل کوئی نئی اجتماعیت وجود میں نہ آسکی، جس کے نتیجے میں ایک عمومی بائوس اور بددلی اس پردے طے میں پھیل گئی۔

واضح رہے کہ اگرچہ ان مجلہ مساعی میں راقم الحروف بھی ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے شامل ہوا تھا، تاہم ایک طویل عرصے تک ان کا اصل اعصابی مرکز بھی لاہور رہا تھا، اور اُن کی رُوبرُوح رواں کی حیثیت بھی حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ہی کو حاصل رہی تھی۔ البتہ کچھ عرصہ بعد

جب محسوس ہوا کہ حجم صاحب موصوف کچھ زیادہ ہی مایوس اور مدلل سمجھ گئے ہیں تو راقم نے ذاتی تحریک اور منگھری کے احباب کے تعاون سے ایک جہز تہ مشافتی اجتماع کا اہتمام کیا جو عزیزین عزیز ہنرتے میں منعقد ہوا اور کئی روز تک جاری رہا۔ لیکن مفسوس کہ یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ نتیجہً مایوسی کے ساتھ عزیز گہرے ہو گئے۔ اور ۱۹۶۰ء کے مکہ جگت جماعت سے علیحدہ ہونے والے اکابر اور عالم ارکان کے طلقے میں کسی نئی تعمیر و تشکیل کے ضمن میں کسی عملی سعی و جہد ترک کیا۔ قریب میں اس کی کسی امید کے آثار بھی باقی نہ رہے اور بالعموم وہ فضا طاری ہو گئی جس کا نقشہ ان الفاظ میں سامنے آتا ہے کہ "اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آنے گا۔" اگرچہ بحمد اللہ اس وقت بھی ذاتی طور پر راقم کے قلبی احساسات کی کیفیت یہ تھی کہ "آگ بھی ہوتی نہ جان آگ دہی ہوتی سمہ!"

راقم المعروف اوائل ۱۹۶۰ء سے اواخر ۱۹۶۵ء تک بعض خاندانی مسائل کی بنا پر کراچی میں مقیم رہا۔ اور اس اثنا میں مولانا عبد الغفار حسن بھی مدینہ منورہ منتقل ہو گئے جہاں ان کا تقرر جامعہ اسلامیہ میں کثینت اسٹاڈنٹ ہو گیا تھا۔

اواخر ۱۹۶۵ء میں راقم تعمیر جدید اور تشکیل نو کے عزم تازہ کے ساتھ لاہور منتقل ہوا اور اس نصب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا وہ اختلاقی بیان جو اس نے ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کی مقرر کردہ جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے شائع کروایا۔ جو دینی حلقوں اور مذہبی جماعتوں کے علاوہ اخبارات و جرائد میں بھی شہرت کے ساتھ زیر بحث آیا، جس کے نتیجے میں "سابقین جماعت" کے طلقے میں بھی کسی نئی تعمیر و تشکیل کی خواہش از سر نو ابھرائی لینے لگی۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں جب مولانا عبد الغفار حسن اپنی سالانہ تعطیلات پر پاکستان آئے تو انہوں نے راقم کے ساتھ کابل اتفاق کرتے ہوئے نہ صرف کراچی اور لاہور بلکہ بعض دوسرے مقامات پر بھی سابق ارکان جماعت کو ایک نئی تنظیم کے قیام پر آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کی اور ان کی ان مساعی کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں قیام اجتماعیت کی وہ چنگاری جو خاکستر کی مٹی تہہ میں دب چکی تھی دوبارہ پڑے آب و تاب کے ساتھ جبرک اٹھی۔

مولانا موصوف تو اپنی تعطیلات کے اختتام پر مدینہ منورہ چلے گئے۔ لیکن ان کی بغیراضری

میں شیخ سلطان احمد صاحب نے اُن کی نیابت کا حق بخوبی ادا کیا۔ اور نہ صرف منتقل خط و کتابت کے ذریعے بلکہ اپنی شدید خانگی اور کاروباری مصروفیات کے علی الرغم ایک فریق کی معیت میں پاکستان کے متعدد اہم مقامات کے سفر کی مصوبت جمیل کر اس تحریک کے پورے کو پران چڑھایا۔

یہ سب جون ۱۹۶۷ء میں اُن محترم اور یہ فاکس اور جمیم آباد ضلع رحیم یار خاں میں سردار محمد اہل خان لغاری مرحوم کے مدد سے پر جمع ہوئے، جہاں طویل گفت و شنید اور بحث و تمحیص کے بعد جم تینوں نے ایک قرارداد پر دستخط کر دیئے جو جولائی ۱۹۶۷ء کے 'میتاق' میں قرارداد رحیم آباد کے نام سے شائع ہو گئی۔ اس قرارداد کا اکثر و بیشتر حصہ تو وہی ہے جو تنظیم اسلامی کی قرارداد آس کے عنوان سے اس کتب کے صفحات ۲۶-۲۷ پر درج ہے۔ البتہ اُس کے پہلے پیرا گراف کی بجائے قرارداد رحیم آباد میں ذیل عبارت درج تھی:

ہم اس امر پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہماری راہ کے موانع کو دور فرمایا اور حالات کو اس طرح سازگار فرمایا کہ ہم ایک بلکہ پھر ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لیے ایک مقام پر جمع ہو سکے۔

ہمارے نزدیک یہی اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم اور انعام و احسان ہے کہ گفت و شنید کے تجربے ہم نے محسوس کیا کہ بھلا اللہ ہمارے نقطہ نظر اور طرز فکر میں بہت حد تک کیسانی و یکسانی موجود ہے اور ہم دین کی کسی چھوٹی یا بڑی خدمت کے لیے جمع ہو کر سعی و جہد کر سکتے ہیں۔

بنا بریں ہم یہ سچے کرتے ہیں کہ ایک ایسی اجتماعیت کا قیام عمل میں لایا جائے جو دین کی جانب سے معاملہ کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے جہد برآ ہوئے میں ہماری مدد و معاون ہو۔ جس میں وہ لوگ بھی شریک ہو سکیں جو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے جماعت

اسلامی میں شامل ہوتے تھے لیکن پھر مختلف مراحل پر اس سے بااؤس ہو کر ٹیئہ ہوتے چلے گئے اور اب کسی برہنہ اجتماعی میں منسلک نہ ہونے کی بنا پر شکی محسوس کر رہے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی شریک ہو سکیں جنہیں اپنے دینی فرائض کا احساس ہو جائے اور وہ اپنی اجتماعی ذمہ

داریوں کی ادائیگی کے لیے کسی اجتماعی نظم میں منسلک ہونا چاہیں:

اور اختتام پر ان الفاظ کا اضافہ تھا:

مندرجہ بالا رہنما اصولوں کی روشنی میں تفصیلی نقشہ کار کی تعیین اور ایک ہیئت اجتماعی کی تشکیل کے لیے طے کیا جاتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اہم خیال لوگوں سے رابطہ قائم کیا جائے اور پھر کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ ایسے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر کسی اجتماعیت کے قیام کی عملی صورت اختیار کر لیں۔

اس کام کی انجام دہی کے لیے فی الحال (شیخ) سلطان احمد (صاحب) کو مامور کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس قرارداد کو بھی الفاظ کا جامہ راقم الحروف ہی نے پہنایا تھا اور پھر جب راقم نے لاہور واپس آ کر اسے مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت میں پیش کیا اور ان کی جانب سے اس کی بحیثیت مجموعی تائید و تحسین کے بعد طے کیا گیا کہ اس کی ایک مختصر وضاحت بھی ضبط تحریر میں لے آئی جائے تو یہ خدمت بھی راقم ہی نے سرانجام دی۔ دریں اثنا لاہور میں منحدہ ایک اجتماع میں مجوزہ اجتماعیت کے ضمن میں ایک مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ جس کے ایک اجلاس میں نہ صرف قرارداد رحیم آباد بلکہ مذکورہ بالا توضیحات کو بھی معمولی تک و اضافے کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ 'یشاق' بابت اگست ۱۹۶۷ء میں یہ تمام چیزیں مجلس مشاورت کی جانب سے شائع ہو گئیں اور ان کی اساس پر ایک اجتماع ۸-۹ ستمبر کو بمقام رحیم یار خاں طلب کر لیا گیا۔

رحیم یار خاں میں ۶-۷ ستمبر کو مجلس مشاورت کا اجتماع ہوا۔ اور بعد ازاں ۸-۹ ستمبر کو کھلے اجلاس ہوئے جن میں اولاً راقم ہی نے مجوزہ قرارداد اور اس کی توضیحات پڑھ کر سنائیں۔ پھر مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن نے مزید تائیدی اور توضیحی تقریریں کیں۔ شرکاء اجتماع کی جانب سے بعض لفظی ترامیم بھی پیش ہوئیں۔ اور بالآخر قرارداد کو توضیحات منظور کر لیا گیا۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ قرارداد رحیم آباد کے ان ابتدائی تین پیروں کی بجائے برادر نقل ہر چکے میں یہ پیرا شامل کیا گیا:

آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عمدہ برآ ہونے میں ہماری مدد ملوں جو:

اور اسی طرح "قرارداد وحیم آباد" کے محمولہ بالا آخری الفاظ کی جگہ یہ الفاظ درج کیے گئے کہ:

مندرجہ بالا رہنما حضوروں کی روشنی میں عملی جدوجہد کے آغاز اور ایک ہیئت اجتماعی کی بقا و
تکفیل کے لیے مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل ایک مجلس مشاورت کے تقرر کی توثیق کی جاتی ہے

۱۔ مولانا امین احسن اصلاحی

۲۔ مولانا عبدالنظار احسن

۳۔ مولانا عبدالحق جامعی

۴۔ شیخ سلطان احمد (مستعد)

۵۔ سردار محمد اہل خان لغاری

۶۔ ڈاکٹر محمد نذیر مسلم

اور ۷۔ ڈاکٹر اسرار احمد

'میتاق' کی ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء کی مشترکہ اشاعت میں ترمیم شدہ قرارداد اور توضیحات بھی شائع
کردی گئیں اور مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالنظار احسن کی تقاریر بھی مزید برآں صرف قرارداد
اور اس کی توضیحات کو ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کے عنوان سے ایک کتابچے کی
صورت میں بھی شائع کر دیا گیا تاکہ اسے زیادہ وسیع حلقے تک پہنچایا جاسکے۔

یہ عرض کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ اگرچہ اس نئی تنظیم کی سربراہی یا ادارت کے لیے
تاحال رسمی طور پر کسی کا نام نہ تجویز ہوا تھا، منظرہ لیکن اس ادارت کے دو رہنما بہر حال مولانا امین احسن
اصلاحی ہی تھے۔ اور اگرچہ اس نئی ہیئت اجتماعی کے نام کے بارے میں بھی متعدد تجاویز کے
پیش ہونے کے باوجود کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا، تاہم چونکہ مولانا اصلاحی تنظیم اسلامی کے نام
پر مقرر تھے، لہذا غیر رسمی طور پر یہ نام بھی تقریباً طے شدہ ہی تھا۔ اگرچہ راقم الحروف نے یہ اختیار منظور
رکھی تھی کہ یہ اسم علم نہ 'میتاق' میں استعمال ہوا، مگر یہ بالآخر کتابچے میں۔

اجتماع وحیم آباد میں اپنے اوداعی خطاب میں بھی مولانا اصلاحی نے اپنی سابقہ تفسیر کے
اعتراف کے ساتھ آئندہ کے لیے عزم مصمم کا اظہار کیا تھا اور اس کے بعد بھی چند ماہ تک ان کی طبیعت
میں نشاط کی کیفیت برقرار رہی اور "ہوتا ہے جاہ پیا پھر کارواں بہارا" کے سے انبساط و اشراج
کا اظہار ہوتا رہا۔ چنانچہ بعض چھوٹے سفار کے علاوہ ایک طویل سفر بھی انہوں نے ازلاہر تا سکھ پور
کلہ اور وہاں سے کراچی بذریعہ ریل کیا جس میں راتوں میں حضرت موسیٰ کے "فتی" کے مانند اُن کھاتہ رہا۔

لیکن غمیں کہ ایک حادثہ تو اس سفر کے دوران ستمبر میں ایک اجتماع عام کے موقع پر پیش آگیا۔ اور بعض دوسرے حواش اس کے کچھ عرصہ بعد رونما ہو گئے جن کے نتیجے میں ایک جانب تو مولانا اصلاحی کی طبیعت بکھر کر رہ گئی۔ اور دوسری جانب بعض اہم رفقاء کے مزاج میں بھی کٹھن پیدا ہو گیا۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے ساتھ سابق تعلق کی قدر مشترک کی اساس پر نئی تنظیم کے قیام کی یہ آفری کو کشش بھی عا' خوش درخشاؤں نے شعلہ شعلہ بول کی مصداق کامل بن گئی!

تاہم راقم المحروف نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ تقاضا مت دین اور اعلا و کلا اللہ کے بلند بالا مقاصد کے لیے خاص صورتی اور انقلابی طریق پر جدوجہد یا بالفاظ دیگر اسلامی انقلاب کی سعی کے لیے ٹیٹھ اسلامی صورتوں پر کسی نئی تحریک کے اجراء اور تنظیم کے قیام کے لیے خود اپنی بساط کے مطابق کوشش جاری رکھے گا۔ خواہ اسے نئے سفر اور نئی تعمیر و تکمیل کے لیے تنہا ہی آغاز کرنا پڑے۔

لاہور میں حلقہ ہائے مطالعہ قرآن اور دارالاشاعت الاسلامیہ کا قیام اور ماہنامہ 'یشاق' کا دوبارہ اجراء پہلے ہی عمل میں آچکا تھا۔ چنانچہ قرآن مجیم کے انقلابی حکم اور ولولہ انگیز دعوت کی اساس پر ہم خیال لوگوں کا ایک بالکل نیا حلقہ وجود میں آچکا تھا جو فطری تدریج کے ساتھ مسلسل ترقی کر رہا تھا۔ چنانچہ اب راقم نے اپنے جسم و جان کی تمام توانائیوں کو بالکل بھروسہ کر کے اور ع' مشرطاً اقل قدم این است کہ جنوں باشی' کے سے اناز میں قرآن کی انقلابی دعوت کے نشرو اشاعت پر مرکز کر دیا۔ جس کے نتیجے میں اولاً ۱۹۶۷ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آیا اور ۲۱ جولائی ۱۹۶۷ء کو لاہور کی شام کو آئیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے افتتاح پر راقم نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کر دیا کہ آئندہ سالوں میں قرآن کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلم تک محدود نہیں رہے گا اور صرف انجمن پر انحصار نہیں ہوگی بلکہ تقاضا مت دین کی اجتماعی جدوجہد کے لیے ایک باضابطہ جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

راقم المحروف کی تذکرہ بالا تقریر، تسوید تیسویں کے جلد اول طے کر کے بعض منافق کے ساتھ کچھ 'یشاق' بابت ستمبر ۱۹۶۷ء میں اور بقیہ اکتوبر اور نومبر کی مشترک اشاعت میں شائع ہو گئی۔ جس کے

اس کی تفسیلی رد و لو کے لیے علامہ ہدایت کی تالیف، دعوت رجوع الی القرآن کا منظرہ پس نظر!

ذریعے راقم نے اپنا ذہنی دھوی پس نظر سابلہ تحریر کی وجہ سے تعلق، اور فرائض دینی کے بارے میں اپنا تصور پوری طرح واضح کر دیا۔ یہ تقریر جو پہلے سرگھنڈیم کے نام سے طبع ہوئی تھی اب بنزیم تنظیم کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے۔

پھر 'یشاق' بابت اکثر نومبر میں راقم نے ایک جانب ایک طویل مقالے کے ذریعے امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران عروج اور زوال کے ڈو ڈو اور دار کی وضاحت اور سرے عروج کی جانب پیش قدمی کے ضمن میں ہجرتِ اسیانی عمل کے مختلف گوشوں کی تعبیر کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی کہ راقم اور اس کی تجویز کردہ تنظیم ان میں سے کون سے گوشے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور دوسری جانب ۱۹۶۷ء کے اجتماع رحیم آباد کی منظر کردہ قرارداد مع توضیحات بھی شائع کر دی اور مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبد الغفار حسن کی تقاریر کے علاوہ وہ تائیدی تبصرے بھی شائع کر دیتے جو ۱۹۶۶ء میں مولانا عبد الماجد دریا بادی اور مولانا عبد الباقی ندوی رحمہما اللہ نے کیے تھے۔ اور اعلان کر دیا کہ ان ہی دھوی و نظری اساسات پر ایک نئی تنظیم کی تشکیل اگلے سال (۱۹۷۰ء) کے اوائل میں ہو جائے گی!

۱۹۶۶ء کی قرارداد کے بارے میں راقم انہوں کو اس وقت بھی یہ احساس تھا کہ اس میں اقامت دین کی فرضیت کا تصور کچھ دب گیا ہے اور اس کی اہمیت کماتر، واضح نہیں ہو رہی۔ اور اگرچہ دین کی اقامت کی اصطلاح اس میں موجود ہے تاہم کیفیتِ مجموعی اس سے اصلاً ایک تبلیغی اور اصلاحی تحریک کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ اس کا اصل سبب بھی راقم کے سامنے واضح تھا، یعنی یہ کہ جماعتِ اسلامی کی تحریک کی قلبِ اہمیت اور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے بجائے اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کا ہونا اختیار کر لینے اور اس کے نتیجے میں اس کے کارکنوں کے مزاج میں سیاسی رنگ کے غلبے نے سابقین جماعت کے حلقے میں ردِ عمل کے طور پر دُور کا جلا چھا جو بھی چھوٹے چھوٹے چہرے پر پتا ہے! اور سانپ کا ڈسارشی سے بھی ڈرتا ہے! کے مطابق "انقلاب" کے نقطہ سے دُور ہے۔ (Allergy) پیدا کر دیتی تھی۔ اس کے باوجود راقم نے نئی تشکیل کے لیے قرارداد میں اس کے طور پر اس کی اختیار کیا اس لیے کہ ایک تو اس کی شدید خواہش تھی کہ ۱۹۶۶ء میں جمع ہونے والے

نام بزرگ اور محبوب اس میں شمولیت اختیار کر لیں اور اس ضمن میں ان پر یہ محنت قائم ہو جائے کہ نئے سفر کا آغاز ٹھیک اسی مقام سے کیا جا رہا ہے جہاں سے سات سال قبل قافلہ منتشر ہوا تھا۔ اور دوسرے اسے یقین تھا کہ جیسے ہی قافلہ معروف سفر ہو گا ساتھ تجربات اور ایک طویل عرصے کے جہد کے باعث جو وحشت پیدا ہو گئی ہے خود بخود رفع ہو جائے گی اور۔۔۔ پھر دلوں کو یاد آئے گا پیغامِ مجدد کے مصداق سب جو ملے ہونے سبق دوبارہ یاد آجائیں گے۔ (جس کا ایک ثبوت بھی راقم کو بالکل ابتدائی مرحلے ہی پر مل گیا تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ سرورِ محمد اہل خاں لغاری محرم کے مزاج میں متذکرہ بلا وحشت کی شدت کے باعث 'قرارِ دو رحیم آباد' میں ان الفاظ کے بعد کہ: 'لہذا پیش نظر جماعت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں فروعی دینی اور اخلاقی تربیت کا کائنات لحاظ رکھا جائے؛ مزید تاکید اور حزم و احتیاط کے لیے یہ الفاظ بھی شامل تھے کہ: اور اسے محض کسی اجتماعی انقلاب کے لیے آلہ کار کی حیثیت نہ دے دی جائے؛۔۔۔ لیکن جیسے ہی جو روٹوں اور حرکت کا آغاز ہوا تو اس وحشت کی شدت میں فروا گئی آگئی۔ چنانچہ رحیم یار خاں میں منظر ہونے والی قرارِ دو سے یہ الفاظ حذف کر دیتے گئے)۔

تنظیمِ اسلامی کا تیسری اجلاس ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۱۹۷۵ء کو مرکزی، نجف، خدام القرآن لاہور کے دفتر واقع ۱۲-۱۱-۱۷، انسانی روڈ، سن آباد، لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں لاہور کے علاوہ کراچی، سکھر، بہاولپور، ساہیوال، فیصل آباد، شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور بعض دوسرے مقامات سے کل ایک سو تین افراد شریک ہوئے۔

ان میں اول تو جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے حضرات کی کل تعداد بھی پانچ چھ سے زیادہ نہ تھی، مزید برآں وہ سب بھی جماعت کے عام ارکان میں سے تھے اور ان میں سے کوئی بھی جماعتِ اسلامی میں کسی کسی اہم منصب پر فائز نہیں رہا تھا۔ (سوائے شیخ عیسیٰ علی صاحب کے کہ وہ کراچی کی جماعت کے معروف اور نمایاں لوگوں میں شامل رہے تھے)۔ گویا یہ پورا قافلہ راقم کی دعوتِ قرآنی کے نتیجے میں عالمِ وجود میں آیا تھا۔ اور اس کے جملہ اساسی تصورات، مطالعہ قرآن مجیم کے اس منتخب نصاب پر مبنی تھے جسے راقم نے اپنی دعوتِ قرآنی کا مرکز و محور بنایا تھا۔

چنانچہ راقم نے اس اجلاس کی افتتاحی نشست میں بھی ایک بار پھر اپنے مطالعہ قرآن کا پختہ پیش کیا اور سورہ صافات کے دوسرے رکوع اور سورہ حجرات کی آیات ۱۳-۱۵ کے حوالے سے فقہین دینی کا جامع تصور اور اس کے ضمن میں شہادت علی الناس اور ظہر و اقامت دین کی تجدید ہم کی فرضیت اور اس کے لیے ان تمام جماعت کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی راقم نے ۶۷ سالہ والی قرارداد تیسرے معروضات پڑھ کر سنائی اور اس کی پر زور نکالت کی صورت اس لیے نہیں کہ یہ اس کے اپنے شہادت قلم تھے، بلکہ اس لیے کہ اقامت دین کے بلند و بالا مقصد کے لیے جو مردان کار و کار ہیں ان کی فرائض اور سیرت سازی کے لیے جو پروگرام اس قرارداد اور اس کی توضیحات کے ذریعے سامنے آتا ہے اس کی صحت و حقانیت پر میرا دل ۱۹۶۲ء میں بھی اتنا ہی مطمئن تھا، جتنا ۱۹۶۶ء میں۔ اور الحمد للہ کہ ان سطور کی تحریر کے وقت بھی (جنوری ۱۹۹۱ء) راقم کو یقین کامل حاصل ہے کہ فرائض دینی کی پہلی دستاویز یعنی بندگی رب اور شہادت علی الناس کے اصول و مبادی کے ضمن میں اس قرارداد اور اس کی توضیحات کو ایک اہم اور جامع دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا جلد اول اسی قرارداد اور اس کے تعلقات پر مشتمل ہے۔) — بہر حال چونکہ یہ اجتماع ان ہی کی اساس پر طلب کیا گیا تھا لہذا اس کا کوئی امکان ہی موجود تھا کہ ان کے کسی نکتے سے شرکاء۔ اجلاس میں سے کسی کو کوئی اختلاف ہو، لہذا ان کی منظوری کا مرحلہ آسانی طے ہو گیا۔

اگلا مرحلہ نام، شرائط شریعت، ہیئت تنظیمی، اور قواعد و ضوابط کی منظوری کا تھا۔ جن میں سے نام کے سلسلے میں کوئی رد و تصحیح ہوتی، نہ ہیئت تنظیمی اور قواعد و ضوابط کے ضمن میں کوئی شکل پیش آتی، البتہ شرائط شریعت میں شامل بعض کڑوی گولیں کا ٹکٹنا موجود الوقت حالات میں بہت سے اسباب کو دشوار ہی نہیں محال نظر آیا۔

چنانچہ نام کے ضمن میں اتفاق راستے کے ساتھ تنظیم اسلامی ہی کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ اور اس وقت کے دستور تنظیم اسلامی کی دفعہ ۱، یہ قرار پائی:

”اس تنظیم کا نام تنظیم اسلامی ہوگا؛

اسی طرح ہیئت تنظیمی کے ضمن میں حسب ذیل امر بھی بالاتفاق طے پا گئے:

دفعہ ۳۔ ہیئت تنظیمی

تنظیمی اقتدار سے پہلے میں سال ایک مجبوری ذمہ دار ہوں گے جس کے ذمہ ان میں سے کسی ایک کی طے کرنا کہ تمہید یا بیان، قرآنہ تمہید حمد کی وہ حرمت زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بحسن و بجا رہی ہوتی ہے اس کی تفصیل دفعہ ۲ میں دی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہو سکیں اس مرحلے کی تکمیل پالیسے نام لوگوں کا ایک عام اجتماع طلب کیا جائے گا جو تنظیم اسلامی کے لیے مشورہ دے گا۔ گراؤنڈنٹ آئینہ میں تنظیمی ڈھانچہ دیا جا رہا ہے جو صرف اس مجبوری نعرہ کے لیے شہد ہوگا۔

دفعہ ۴۔ مرکزی نظام

(الف) ڈاکٹر امیر احمد کو تنظیم اسلامی کے دائمی عمومی کی ہیئت عاملہ کی اجازت اس مجبوری نعرہ میں "امروزہ شوریہ ہیئتہ" کے وسیع تر اصول کے تحت تنظیم کے معاملات کو بھی چلائیں گے اور اس کی حرمت کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع تر ملنے بحسن و بجا رہنے کی کوشش کیا جائے گی۔ ہر ایک میں شوریہ کو بھی مزید کرنے کے باز ہوں گے لیکن ان کو حق اختیار حاصل ہوگا۔

(ب) تمام ہیئتہ تنظیم باقی عمومی کی اصلاح فی العموم کے پابند ہوں گے۔

وہ "قواعد وضوابط" جو حکمران اصولی باتوں کے طے ہو جانے کے بعد زیادہ تفصیلی قواعد قوانین کی چمکاں ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی، لہذا وہ سب کے سب پانچ دفعات کی صورت میں نکل تین صفحات میں سامنے آئے اور وہ بھی بالاتفاق طے ہو گئے۔

جہاں تک مذکورہ بالا دفعہ کی دفعہ ۲ میں شامل "شرائط شمولیت" کا تعلق تھا اس کی بھی کل چھپیں سے صرف ایک یعنی جو عمومی شق ایسی تھی جو بہت سے اسباب کے تنظیم میں شامل ہونے کی راہیں دکاوت بن گئی۔ اس لیے کہ اس کی رو سے یہ لازم آتا تھا کہ صرف وہی لوگ تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کر سکیں گے جو تہذیبی اور فنی ہر نوع کے سودی لین دین سے عملاً تائب ہو جائیں اور ایسے اداروں کی عازمت بھی ترک کر دیں جن میں سودی لین دین کا غلبہ ہو جیسے بینک اور انشورنس کمپنیاں وغیرہ۔ مزید برآں سرکاری حاصل یعنی انٹیکس، سیزیکس وغیرہ کے ضمن میں بھی کسی غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ ان شدید قوتیں اور موجودہ احوال و ظروف کے اقتدار سے تقریباً ناگہن اصل پابندیوں کا

نتیجہ یہ نکلا کہ ان ایک تلواریں حضرات میں سے جو اس اجتماع میں ابتداء شریک ہوئے تھے صرف
 بائیس حضرات نے تنظیم میں بافضل شرکت اختیار کی۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تنظیم کی "شرائط شمولیت" کی تذکرہ بلا
 شق بھی اصولاً جماعت اسلامی ہی کے فلسفہ و اصول تنظیم کے تسلسل کی منظر تھی۔ اور اس معاملے میں اگرچہ
 ذاتی طور پر اقامت الحروف کے نظریات تبدیل ہو چکے تھے، تاہم چونکہ شدید دلی خواہش تھی کہ جماعت سے
 علیحدگی اختیار کرنے والے احباب و اکار کی زیادہ سے زیادہ تعداد اس نئے قافلے میں شامل ہو اور ان
 کی اکثریت بالخصوص اہم شخصیتوں کے تصورات میں ابھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، لہذا جہاں یہ مناسب سمجھا
 گیا کہ تنظیم کے مستقل دستور کے معاملے کو ابھی "کھلا" (Open) رکھا جائے وہاں "شرائط شمولیت"
 کے ضمن میں بھی سابقہ طرز فکر ہی کو برقرار رکھا گیا۔

تنظیم اسلامی کے ابتدائی عارضی دستور کی دھند نمبر ۲، صرف مذکورہ شق ۱۱ میں معمولی لفظی تبدیلی کے
 ساتھ پیش نظر لگانے کے حتمی دور میں "عقائد اور بنیادی دینی تصورات" کے عنوان سے شامل ہے۔
 یہ بھی اصولاً راقم ہی کی تحریر پر مشتمل ہے جو جوالاتی سکھ اور مارہا سھلنے کے درمیانی مرحلے میں سپرد رقم ہوئی۔
 اس کی ترتیب و تسوید میں راقم نے جماعت اسلامی کے دستور سے بھی استفادہ کیا، اور بعض علماء نے بھی
 مشورہ کیا جن میں مولانا سید موسیٰ ظفر ندوی قابل ذکر ہیں جو اگرچہ اس وقت تک جماعت اسلامی میں شامل
 تھے تاہم ان کی جماعت کی تقابلی مصروفی اور مرکزی قیادت کے ساتھ وہ کشاکش شدت کے ساتھ جاری
 تھی جس کے نتیجے میں وہ لاکھوں میں جماعت سے خارج کر دیئے گئے۔

اس کی پہلی شق ایمان، عمل اور ایمان منضعل پر مشتمل ہے۔ جن کی تشریح میں اہل سنت کے عقائد
 اختلاف کن جامعیت کے ساتھ آگئے ہیں، واضح رہے کہ جماعت اسلامی کے دستور میں ان کا کوئی تذکرہ
 نہیں ہے۔

دوسری شق کلہ طیبہ اور کلہ شہادت پر مشتمل ہے جس کی تشریح کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے
 دستور سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ توحید الہی اور رسالت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے
 اقرار کے حضرات و معتزلات کو دستور جماعت میں بلاشبہ نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ایک

روایت یہ بھی ہے کہ یہ تحریر اصلاً مولانا محمد منظور نعمانی کی ہے۔ واللہ اعلم)۔ البتہ ایک جانب اس میں سے وہ الفاظ حذف کر دیئے گئے جن پر علماء کرام کی جانب سے شدید اعتراضات کیے گئے تھے، اور دوسری جانب غلط صحابہ اور مجتہدین خلافت راشدہ سے متعلق شقوں کا اضافہ کیا گیا۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تربیت اور تزکیے کا شاہکار ہونے کے اعتبار سے عظیم و توقیر کے مستحق بھی ہیں۔۔۔۔۔ اور بغزائے الغلو قرآنی "مَحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ" اور "فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهِ وَاَعَزَّوْهُ وَقَصَّوْهُ" انھیں کفر و کفر و احباب اعدا و انصار ہونے کی بنا پر اس کا استحقاق کامل بھی رکھتے ہیں کہ انھیں کفر و کفر کے ہر امتی کے دل میں اُن کے لیے شدید محبت اور احسان مندی کے جذبات موجود ہوں۔۔۔۔۔ اور خلافت راشدہ چونکہ اصلاً خلافت علیٰ منہاج النبوتہ کی حیثیت رکھتی ہے لہذا اُس کے دوران میں جن امور پر امت کا اجماع ہو گیا انہیں دین کے دستوری اور قانونی نظام میں حجت کی حیثیت حاصل ہے۔۔۔۔۔ اس طرح غلط صحابہ اور مجتہدین خلافت راشدہ کو گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت مبارکہ کے ساتھ تشریح اور ضمیمہ کی حیثیت حاصل ہے!

تیسری اور چوتھی شقیں شرک، کفر اور ذمائم اخلاق سے برارت، اور جملہ ذنوب و معاصی سے توبہ و استغفار پر مشتمل ہیں۔ جن کے ضمن میں جہاں کفر اور شرک کی حقیقت اور اُن کی اقسام کی مختصر مگر جامع وضاحت آگئی ہے وہاں فرائض و واجبات دینی اور عزائم و نہیات شرعی کا اجمالی تذکرہ بھی ہو گیا ہے۔ اور ان ہی میں وہ کڑوی گولیاں بھی شامل ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، یعنی کسب معاش کے سلسلے میں عزائم و منکرات سے اجتناب!

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے! ابتداء میں جو صورت اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ صرف وہی لوگ تنظیم اسلامی میں شامل ہو سکیں گے جو ان منکرات کو یا افضل ترک کر چکے ہوں یہی وجہ ہے کہ تا سبھی اجلاس کے ابتدائی ایک تلو تلو شرکار میں سے صرف بلائٹھ حضرات تنظیم میں شمولیت اختیار کر سکے!۔۔۔۔۔ لیکن تقریباً ڈھائی سال بعد جب تنظیم کے لیے بیعت کے نظام کو اختیار کیا گیا تو متعلقہ عبارت میں بھی مناسب تبدیلی ترمیم کر دی گئی اس لیے کہ نظام بیعت کا تو اصل الاصول ہی یہ ہے کہ کوئی شخص جب جہاں اور جیسے ہی عزم اور ارادہ کر لے کہ وہ مسلمان بنے اور مسلمان برے نکال دے گا اور اپنے جملہ فرائض دینی کو ادا کرنے کے لیے

امکان مہر کر شاں رہے گا فوراً ہی مت کر کے، اہ حق کے قافلے میں شامل ہو سکتا ہے، تعلیم تربیت اور تزکیے کے مراحل بعد میں آتے ہیں، گویا اب اس شوق کی حیثیت اس پیشگی تہنید کی ہے کہ جو شخص بھی تنظیم میں شامل ہو وہ اچھی طرح جان لے کہ اسے ان منکرات و محرمات کو جلد از جلد ترک کرنا ہے۔

پانچویں اور چھٹی شقیں دو معاہدوں پر مشتمل ہیں، پہلا عہد اللہ سے کہ میں نے اپنا رخ ہر جانب سے یکسو ہو کر صرف تیری جانب کر لیا ہے اور اب میری نماز اور قربانی کی طرح میرا جینا اور مرنا بھی صرف تیرے لیے ہو گا۔ اور دوسرا عہد تنظیم اسلامی سے کہ میں اس کے نظم کی پابندی اور اس کے ایسے جلد احکام کی اطاعت ہو شریعت کی کسی واضح فرض کے خلاف نہ ہوں، مع و طاعت کی شیعہ اسلامی روح کے مطابق کروں گا!

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو گئی جوگی کہ تنظیم کے عقائد اور بنیادی دینی نظریات کی تندرست بلا چھ شقوں کا تعلق ان تین اہم دینی اصطلاحات سے ہے جو تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت کے عنوان سے چند آیات قرآنیہ کے ساتھ ابتدا ہی سے طے طور پر شائع ہوتی رہی ہیں: یعنی تہجد ایمان، توبہ اور توبہ عہد!۔ چنانچہ پہلی دو شقوں کا تعلق تہجد ایمان سے ہے، درمیانی دو کا توبہ سے، اور آخری دو کا تہجد ایمان سے!!

اللہ تعالیٰ ہم سب کے قلوب و اذہان کو ایمانِ حقیقی اور یقین و معرفت کے نور سے منور فرمائے! ہمیں جملہ فرض و واجبات کے التزام نام اور منکرات و منہیات سے اجتناب کلی کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے جملہ عہد و عقود کے ایفاء کمال کی ہمت عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین!

ذاتی طور پر راقم المحروف کی رائے جماعت سے علیحدگی کے دو سال کے اندازہ یعنی اپریل ۱۹۵۹ء کے گل جگ ہی یونین چلی گئی کہ قاضی دین کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت کی تنظیمی اساس ہیئت کے سنون، اور انڈر اصول پر قائم ہونی چاہیے نہ کہ عہد حاضر کے مغرب سے درآمد شدہ توری اور جمہوری اصولوں پر۔ تاہم راقم کے نزدیک نہ مقدم الذکر ہیئت تنظیمی فرض یا واجب کے درمیان ہے نہ منظر الذکر واجبات کے دائرے سے خارج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آٹھ سال بعد ۱۹۶۷ء میں اذکار رحیم آباد اور پھر رحیم یار شاں میں ایک نئی تنظیم کے قیام کا فیصلہ ہوا اور راقم اس میں پورے انشراح

ہی نہیں، بھرپور جوش و فہوش کے ساتھ شریک ہوا، حالانکہ جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، یہ بات ظہر من الشمس تھی کہ اس بارے کے دو لہا کی حیثیت مؤمنین آسن اصلاحی صاحب کو حاصل تھی اور وہی بلاشبہ ریب و شک مجوزہ تنظیم کے امیر بنتے اور ان کے بارے میں یہ بات ظاہر و باہر اور معلوم و معروف تھی کہ ان کا شدید رجحان ہی نہیں قطعی و حتمی راستے دستوری اور جمہوری نظام جماعت کے حق میں ہے۔

اسی طرح مزید آٹھ سال بعد یعنی ۱۹۶۵ء میں جب موجودہ تنظیم اسلامی کی تاسیس کا مرحلہ آیا تب بھی راقم نے نظام جماعت کے مسئلے کو دکھلا رکھا اور پہلے تین سالوں کو عبوری دور قرار دیتے ہوئے اپنی حیثیت صرف کنوینشن کی رکھی تاکہ جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے دوسرے بزرگ حضرات بھی شمولیت پر آمادہ ہو جائیں تو ان کے شور سے بلکہ صوابدید کے مطابق ہیستمت تنظیمی تشکیل دے لی جاتے! اور اس میں ہرگز کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ اگر وہ حضرات شمولیت اختیار کر لیتے تو لامحالہ ایک دستوری اور جمہوری نظم ہی قائم ہوتا۔

لیکن جب دو ڈھائی سال کے انتظار کے بعد ثابت ہو گیا کہ بزرگ سابقین جماعت میں سے کوئی ایک شخص بھی اس نئے قافلے میں شمولیت پر آمادہ نہیں ہے، تو چار و ناچار راقم کو یہ فیصلہ کر لینا پڑا کہ اب اسے اپنی ذاتی صوابدید ہی کو بروئے کار لانا ہے۔ اور اپنی رائے کو پورے شرح و بسط کے ساتھ رفد کے سامنے رکھ دینا ہے۔ تاکہ انجوائے الفاظ قرآنی: لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيِيَ مَنْ سَخِيَ عَنْ بَيِّنَةٍ (الانفال: ۴۲) جسے ساتھ دینا ہے وہ بھی پورے انشراح صدر کے ساتھ دے اور جسے ساتھ چھوڑ دینا ہے وہ بھی خوب سوچ سمجھ کر علیحدہ ہو!

تنظیم کا پہلا سالانہ اجتماع ۲۵ تا ۲۷ مارچ ۱۹۶۶ء اپنے تمام تاسیس ہی پر متحد ہوا تھا اور دوسرے سالانہ اجتماع کے انعقاد کے لیے بھی ادا فرما رہے تھے ۱۹۶۶ء کی تاریخوں کا تعین ہو چکا تھا کہ اچانک ملکی انتخابات میں حکومت وقت کی جانب سے کی گئی دھاندلیوں کے خلاف احتجاجی مظاہروں نے ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کر لی جو تحریک نظام مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے موسوم ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مٹکل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ لہذا تنظیم کے اجتماع کو ملتوی کرنا پڑا۔

مہر اور ۵ جولائی ۱۹۶۶ء کی درمیانی شب کو ملک میں مارشل لا نافذ ہوا تو اس دوران کی

صورت بحال ہوتی اور چونکہ کچھ اندازہ تھا کہ تین ماہ بعد مارشل لا کے اختتام پر ملک میں دوبارہ کیسے حالات پیدا ہو جائیں، لہذا بعض اہم رفقہاء کے مشورے سے طے کر لیا گیا کہ پہلی فرصت میں تنظیم کا ایک اجتماع منعقد کر لیا جائے جو دوسرے اور تیسرے سالانہ اجتماعات کا قائم مقام ہو اور اس میں تنظیم کے مستقل نظام کے بارے میں حتمی فیصلہ کر لیا جائے۔

یہ اجتماع جو کچھ دو اجتماعات کے قائم مقام ہونے کے ناطے، اوجھڑا اہم موضوعات پر تفصیلی گفت و شنید اور بحث و تمحیص کی ضرورت کے پیش نظر، پورے ایک ہفتے کے لیے طلب کیا گیا تھا ۵ تا ۱۱ اگست ۱۹۷۷ء کو قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں جاری رہا۔ اور اس میں راقم نے حسب ذیل تین تنقیحات کے ذیل میں نہ صرف یہ کہ اپنے دینی حکم کو پوری وضاحت اور شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا بلکہ جملہ شرکائے اجتماع کو بھی اظہار خیال اور اختلاف رائے کا پورا موقع فراہم کیا:

۱۔ اقامتِ دین، شہادتِ ملی الناس، اور غلبہ و اظہارِ دین کی سعی و جہد نقلی عبارت یا آسانی نیکی نہیں بلکہ از روئے قرآن و حدیث بنیادی دینی فرائض میں شامل ہے!

۲۔ اس دینی فریضہ کی ادائیگی کے لیے التزامِ جماعت واجب ہے۔

۳۔ ایسی دینی جماعت کی ہیئت تنظیمی مغرب سے درآد شدہ دستوری، قانونی اور جمہوری طرز کی نہیں بلکہ قرآن و سنت اور اسلاف کی روایات سے مطابقت رکھنے والے بیعت کے

اصول پر مبنی ہونی چاہیے؛

الحمد للہ کہ ان تنقیحاتِ ثلاثہ پر پورے چھ دن سیر حاصل گفتگو ہوئی جس کے نتیجے میں شرکاء اجتماع کی غالب اکثریت نے راقم کے خیالات اور نظریات سے کمال اتفاق کیا اور بالآخر ناظم عمومی جناب شیخ جمیل الرحمن صاحب کی تحریک پر حسب ذیل قرارداد منظور ہو گئی:

تنظیمِ اسلامی کا یہ اجتماع عام حسب دفعہ ۳ دستور تنظیمِ اسلامی طے کرتا ہے کہ:

۱۔ آئندہ تنظیمِ اسلامی کا نظام مغرب سے درآد شدہ دستوری قانونی اور جمہوری اصولوں کے بجائے قرآن و سنت سے ماخوذ اور اسلاف کی روایات کے مطابق بیعت کے اصول پر مبنی ہوگا۔ چنانچہ تنظیمِ اسلامی کے داعی عمومی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آج کے بعد سے آئندہ تنظیمِ اسلامی ہوں گے۔ اور تنظیم میں داخلان کے ساتھ للامت فی المعروف کی بیعت کا شخصی رابطہ استوار کرنے سے ہوگا اور

چرچا عام ہوا تو نہ صرف مسخر اور استہزاء بلکہ تردید اور مخالفت کا بازار بھی گرم ہوا۔ لیکن بعد اللہ اب جبکہ اس نظام کو بافضل چلتے ہوئے چودہ برس ہونے کو آئے ہیں اور نہ صرف اندرون ملک کثیر تعداد میں بلکہ بیرون ملک بھی کہ اٹھلان اور امریکہ میں مقیم حضرات نے بھی معتبر تعداد میں اپنے فرائض نبوی کی ادائیگی کے لیے بیعت کا قلابہ گردن میں ڈالنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ہے ہم اپنے دلوں میں گہرے تحقیر آمیز اطمینان کا احساس موجزن پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک مردہ سنت کے احیاء کی توفیق عطا فرمائی۔ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ!!

بیرونی مسخر اور مخالفت کو برداشت کرنے سے زیادہ کٹھن مرحلہ اُن غلط تصورات کے خاتمے کا تھا۔ بیعت کے لفظ کے ساتھ لا محالہ وابستہ ہو گئے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور مکروہ تصور یہ ہے کہ بیعت کے نظام میں نہ باہمی مشاورت کی کوئی گنجائش ہے نہ اختلاف رائے اور اظہار خیال کا کوئی موقع! چنانچہ ہمیں اس غلط تصور کی نفی اور اس حقیقت کے اثبات میں بہت محنت بھی کرنی پڑی اور بہت سادقت بھی صرف کرنا پڑا کہ نظام بیعت میں اختلاف رائے کی گنجائش، اظہار خیال کے مواقع، اور باہمی مشاورت کا میدان نام نہاد جمہوری نظام سے بھی وسیع تر موجود ہے۔ اور فرق صرف اتنا ہے کہ جمہوری نظام میں آخری فیصلہٴ بندگان کو گنا کرتے ہیں تو لا نہیں کرتے؛ کے مصداق آراہ کی گنتی کی بنیاد پر ہوتا ہے جبکہ نظام بیعت میں اظہار رائے اور کلمی بحث تمحیص کے بعد آخری فیصلہ صاحب امر کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے! گو نظام بیعت میں اصول قرآنی: «وَلَقَرَهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ» (الشوریٰ: ۳۸) کی بافضل تعبیل حکم قرآنی: «وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلٰی اللّٰهِ» (آل عمران: ۱۵۹) کے مطابق ہوتی ہے۔

دوسری جانب اس تصور کا خاتمہ بھی ہرگز آسان نہ تھا کہ مشاورت، باہمی کالائزی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا جائے اس لیے کہ عہد حاضر میں سلطانی جمہور کا تصور نہ صرف یکہ عد درجہ العلیٰ اور ہمہ گیر ہو چکا ہے بلکہ لوگوں کے شعری نہیں تحت الشہود کی گہرائیوں میں اس حد تک سزا دیت کر چکا ہے کہ اس بات کی بیعت کے نظام کو اصولاً تسلیم اور اختیار کرنے کے بعد بھی اس پر صراحتاً برقرار رہتا ہے کہ امیر کو شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کا پابند ہونا چاہیے!

الغرض، تعلیم اسلامی کے لیے بیعت کا نظام اصولی طور پر ۱۹۷۶ء میں اختیار کر لیا گیا تھا اور

اس کے بعد سے علامت تنظیم کی گاڑی اسی پٹری پر چل رہی ہے تاہم اس کے مضمرات اور تضمرات کے واضح ہونے اور اسی کی بنیاد پر ایک جماعتی نظام کی تفصیلی تشکیل اور اس کے حدود و خال کے صفحہ قرطاس پر مرسوم ہونے میں کم و بیش دس سال کی مدت صرف ہوئی۔ اور نہ صرف اصولی غور و خوض بلکہ دس سالہ تجربات کی روشنی میں تنظیم اسلامی کے لیے ایک تحریری نظام العمل کی ترویج و تبلیض کا مرحلہ اوائل ۱۹۸۵ء میں شروع ہو سکا۔ جبکہ تنظیم کی مرکزی مجلس مشاورت نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲، ۳، ۴ مارچ ۱۹۸۵ء میں مضابطہ طے کیا کہ:

”تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے جمعیت کی اساس اگرچہ دس سال قبل اختیار کر لی گئی تھی لیکن فی زمانہ کسی حیثیت اجتماعہ کے لیے اس سنون اساس کے متروک العمل ہونے کے باعث تنظیم اسلامی کو بھی اس کے عملی تقاضوں سے کال ہم آہنگی کے ضمن میں تدریجی مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ آج ضمن میں اگرچہ متحدہ فیصلے مختلف اوقات میں کیے جاتے رہے ہیں لیکن ان کو باضابطہ ضبط تحریری نہیں لیا گیا۔ اسی طرح اگرچہ تنظیم کی قرارداد و تاسیس اور اس کی توضیحات میں بعض تاریخی اسباب کی بنا پر فریضہ اقامت دین کی اہمیت اور اس کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کے لزوم کے قدرے غمی اور غیر نمایاں ہونے کے پیش نظر تنظیم کے آٹھویں سالانہ اجتماع میں یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ آئندہ تنظیم اسلامی محض اصلاحی اور دعوتی نہیں بلکہ انقلابی تنظیم ہوگی۔ تاہم ابھی تک یہ بات بھی پوری وضاحت کے ساتھ تحریری طور پر سامنے نہیں آئی۔ لہذا ضروری ہے کہ ان دونوں امور کو مجوزہ نظام العمل میں صراحت کے ساتھ درج کر دیا جائے اور جیسے کہ پانچ سال قبل طے کیا گیا تھا تنظیم اسلامی کی قرارداد و تاسیس مع توضیحات اور شرائط شمولیت پر مشتمل منضبط تحریر کو آئندہ تنظیم کی آئین و دستوری اساس نہیں بلکہ اس کے دعوتی اور تربیتی لٹریچر کا اہم اور اساسی حصہ سمجھا جائے۔“

الحمد للہ کہ اندیشہ اثنائے تنظیم کا تفصیلی ”نظام العمل“ تیار ہو کر سلسلہ اشاعت تنظیم اسلامی نمبر ۱ کی حیثیت سے شائع ہوا ہے۔ جبکہ پیش نظر کتاب تنظیم کے اساسی نظریات کی وضاحت پر مشتمل ہونے کے ناتے اس کے دعوتی اور تربیتی لٹریچر کا اہم حصہ ہے۔

اس کتاب کے تیسرے اور مختصر ترین حصے میں ”فرائض دینی کا جامع تصور“ مختصر ترین الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ یہ راقم الحروف کے عمر بھر کے مطالعہ قرآن و حدیث اور سنت و سیرت رسول

صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاصے اور لب لباب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس اعتبار سے بلاشبہ تنظیم کے اساسی دینی حکم کا جزو لا ینفک ہے۔

راقم نے اپنے ان تصورات کے سلسلے میں علماء کرام سے استصواب اور ان کی آراء سے رفقا تنظیم کو براہ راست آگاہ کرنے کے لیے یہ اہتمام کیا کہ ۱۹۸۵ء میں تنظیم کا سالانہ اجتماع بھی ۲۳ تا ۲۸ مارچ سل چھ دن جاری رہا۔ اور انہی ایام میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ محاضرات قرآنی بھی منعقد کر لیے گئے۔ چنانچہ جامع القرآن، قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں صبح کے اوقات میں تنظیم کے سالانہ اجتماع کی کارروائی جاری رہتی تھی اور شام کو تین ساٹھ تین گھنٹے کا اجلاس محاضرات کا ہوتا تھا۔ جن کا موضوع میری یہی تحریر تھی جس پر تقریباً ایک صد علماء کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ جن میں سے پچیس حضرات نے باضابطہ شرکت فرما کر بلاشاذ خطاب فرمایا اور تقریباً اتنے ہی حضرات نے اپنی آراء تحریری صورت میں ارسال کر دیں۔ چنانچہ روزانہ اوسطاً چار حضرات کا خطاب ہوا جن میں سے بعض نے میرے خیالات کی کامل تصویب فرمائی بلکہ بعض نے جزوی اتفاق کا اظہار فرمایا، بعض نے شدید تنقید کی، یہاں تک کہ بعض نے فقرے بھی چست کیے اور مذاق اڑایا۔ احمد نذیر تنظیم کے گگ بگ ساڑھے تین سو فقہار نے جملہ تقاریر کو پورے سکون و اطمینان اور کامل توجہ و اہتمام کے ساتھ سنا۔ جس سے بعد ازاں ان کے اعتماد ہی میں اضافہ ہوا۔ اور کبھی ایک کے دل میں بھی فریض دینی کے اس جامع تصور کے بارے میں کوئی اشتباہ پیدا نہ ہوا۔

ذاتی طور پر راقم کو ان محاضرات سے دو فائدے حاصل ہوئے؛ ایک تو روادری میں کمی ہوتی عبارت میں بعض الفاظ کے بے محل استعمال سے جو مغالطے پیدا ہوتے ان کی اصلاح کی صورت پیدا ہو گئی۔ اور دوسرے یہ کہ راقم کو اپنے فکری مجموعی تصویب مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا مفتی سیاح الدین کاکانیل، مولانا سعید عنایت اللہ شاہ بخاری، مولانا سعید نظیر حسین ندوی اور ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی ایسے اصحاب علم و فضل سے حاصل ہوئی۔ جس سے وہ متفق گردیدے بولے بارائے من؛ اے کے مصداق خود راقم کے اعتماد میں اضافہ ہوا۔ فخر اہم اللہ عنی وعن جمیع رفقاء التنظيم خیر الجزاء۔ امین

اسرار اللہ علی

تَنْظِيرُ اسْلَامِي

کی اسکی دعوت

تجدیدِ عہد

توبہ

تجدیدِ ایمان

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ
الَّذِي نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ

(النساء، ۱۳۶)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا

(التعميم، ۸۱)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّتِي وَاثَقَكُمْ
بِهَا إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

(المائدة، ۷)

وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أَوْفٍ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ

(البقرة، ۲۴)

حصہ اول



قرار دادِ تاسیس مع توضیحات

(منظور شدہ اجتماعِ رحیم پارانہ ۸-۹ ستمبر ۱۹۶۷ء)

اور

تقاریر مولانا امین احسن اصلاحی و مولانا عبد الغفار حسن

و

تقاریر مولانا عبد الماجد دریابادی و مولانا عبد الباقی ندوی

(شائع شدہ 'یشاق' نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء)

قراردادِ تاسیس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد و معاون ہو۔“

ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات، دین کا اصل موضوع ہے، اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الہی کے حصول میں مدد لے لے۔ لہذا پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اُس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کما حقہ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور شایع سنت سے ان کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لیے ان کا جذبہ

ترقی کرتا چلا جائے۔ ان تمام امور کے لیے ذہنی اور علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کے اہتمام کی جانب خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔

دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک ”الذین التصیحة“ کی رُوح اور الاقرب فالاقرب“ کی تدریج ضروری ہے۔ لہذا دعوت و اصلاح کے عمل کو فرد سے اولاً کنبہ اور خاندان اور پھر تدریجاً ماحول کی جانب بڑھنا چاہیے۔ اس ضمن میں نئی نسل کی ذہنی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ناگزیر ہے۔

عائتہ الناس کو دین کی دعوت و تبلیغ کی جو ذمہ داری امتِ مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے، اس کے ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ کے باطل عقائد و رسوم اور ویرجہ دید کے گمراہ کن افکار و نظریات کا مدلل ابطال کیا جائے اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لیے کتابِ سنت کی ہدایت و رہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے، تاکہ ان کی اصلی حکمت اور عقلی قدر و قیمت واضح ہو اور وہ شبہات و شکوک رفع ہوں جو اس دور کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔“

توضیحات

قرار داد میں جن امور کی وضاحت کی گئی ہے ان میں اولین اور اہم ترین امر یہ ہے کہ ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی اور روحانی تکمیل اور فلاح و نجات دین کا اصل موضوع ہے اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے اصل نصب العین یعنی رضائے الہی کے حصول میں مدد دے۔ اس تصریح کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ماضی میں مسلمانوں کو ان کی فیزیکی تو بالکل ٹھیک یاد کرائی گئی کہ جس دین کے وہ مدعی ہیں اسے دنیا میں عملاً قائم کرنے کی سعی و جہد بھی ان پر فرض ہے اور یہ کہ دین محض ذاتی عقائد اور کچھ مراسم عبودیت یعنی انسان اور رب کے مابین پر ایویوٹ تعلق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی پوری انفرادی اجتماعی زندگی کو اپنے احاطے میں لینا چاہتا ہے لیکن ان امور پر اس قدر زور دیا گیا کہ بندے اور رب کے مابین تعلق کی اہمیت اور افراد کی اپنی علمی، اخلاقی اور روحانی ترقی نظر انداز ہوتی چلی گئی۔ سائنہ جو کام پیش نظر ہے اس کے اصول و مبادی میں یہ نکتہ بہت زیادہ قابل لحاظ رہے گا کہ ایک مسلمان کا اصل نصب العین صرف نجات اخروی اور رضائے الہی کا حصول ہے اور اس کے لیے اسے اصل زور اپنی سیرت کے تطہیر و تزکیے اور اپنی شخصیت کی تعمیر و تکمیل پر دینا ہوگا جس سے تعلق مع اللہ اور محبت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اضافہ ہوتا رہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ اخلاص پیدا ہوتا چلا جائے۔ دین کی تائید و نصرت اور شہادت و اقامت یقیناً فرائض دینی میں سے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی ایسی اجتماعی جہد و جہد ہرگز جائز نہیں

ہے جو افراد کو ان کے اصل نصب العین سے غافل کر کے انہیں محض ایک دنیوی انقلاب کے کارکن بنا کے رکھ دے! — چنانچہ پیش نظر اجتماعیت میں اولین زور افراد کی دینی و اخلاقی تربیت پر دیا جائے گا اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا کہ — ”اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباع سنت سے ان کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لیے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے“

”دینی جذبات کے جلا“ کے لیے قرآن مجید کی پلانا فہ تلاوت مع تدبیر، سیرت نبوی اور سیرۃ الصحابہ کا مطالعہ، مجالس و عظ کا انعقاد، باہمی مذاکرہ، آخرت اور ضامین غفلت پر مشتمل آسان لٹریچر کی اشاعت پر زور دیا جائے گا۔

”علم میں مسلسل اضافے“ کے لیے عربی زبان کی تحصیل کی عام ترغیب اور اس کا اہتمام قرآن حکیم اور حدیث نبوی کے باقاعدہ حلقہ ہائے درس کا قیام اور جاہلیتِ قدیمہ جدیدہ پر اسلام کے نقطہ نظر سے تنقیدی کتب کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا دونوں امور سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جاہلیتِ قدیم و جدیدوں کے اثرات قلوب و اذان سے محو ہوں، عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو اور صحیح اسلامی عقائد کی تخم ریزی و آبیاری ہو سکے۔

شرکائے تنظیم کے دینی جذبات کے جلا اور علم میں اضافے کا براہ راست اثر عملی زندگی پر پڑے گا اور ان کی زندگیوں میں دینی تبدیلی عملاً پیدا ہوتی چلی جائے گی لیکن اس میدان میں اس امر کی شدید ضرورت ہوگی کہ اس بات کی کوئی نگرانی کی جائے کہ تیسری

ہم جیتی ہو اور اعمالِ انسانی کے مختلف گوشوں میں متناسب انداز میں ظہور پذیر ہو چنانچہ عبادات میں ذوق و شوق، معاملات میں احتیاط و تقویٰ اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں شغف اور دلچسپی متناسب انداز میں بڑھے۔ یہ صورتِ حال کہ جلسوں کے انعقاد کے ضمن میں تو پابندی بھی ملحوظ رہے اور جوش و خروش کا بھی مظاہرہ کیا جائے لیکن نماز باجماعت کی پابندی گراں محسوس ہو اور نوافل سرے سے خارج از بحث ہو جائیں؛ دین کی نصرتِ حمایت کا جذبہ تو ترقی کرتا چلا جاتا ہے لیکن تزکیہ باطن کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے یا سنتِ نبویؐ کی محبت و اہمیت پر دلائل تو ازیں ہوں لیکن خود اپنی زندگی میں اتباعِ نبویؐ کی جھلک نظر نہ آئے، نہ صرف یہ کہ افراد کے حق میں ستم قاتل ہے بلکہ خود اجتماعیت کے لیے بھی سخت مضر اور ہلک ہے۔ لہذا اس امر کی کڑی نگرانی ضروری ہوگی کہ شرکار میں عبادات سے شغف، اتباعِ سنت کا جذبہ، معاملات میں حلال و حرام کی حدود و قیود کی پابندی اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں سے دلچسپی تو وافق و متناسب کے ساتھ برہمیں۔ خصوصاً یہ احتیاط تو انتہائی لازمی ہوگی کہ پیش نظر اجتماعیت کے تنظیمی ڈھانچے میں جو لوگ آگے آئیں وہ تیزی و مستعدی اور نفاست و باقاعدگی سے کام کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے چاہے کسی قدر تہی دست ہوں، عبادات اور اتباعِ سنت کے ذوق و شوق سے ہرگز تہی دامن نہ ہوں۔

شرکائے جماعت میں مندرجہ بالا تہیلینوں — یا الفاظ دیگر ان کے نفوس کے تزکیہ اور ان کی شخصیت کی دینی تعمیر کے لیے جہاں ذہنی و علمی رہنمائی اور فکری تربیت لازمی و لا بدی ہیں وہاں عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کا موثر اہتمام بھی ضروری و ناگزیر ہے۔ اس غرض کے لیے مختلف مقامات پر تربیت گاہوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جاسکتا ہے اور ایک ایسی مرکزی تربیت گاہ کا قیام بھی عمل میں لایا جاسکتا ہے جس میں مختلف مقامات کے رفکار گروپس (GROUPS) کی صورت میں شریک ہوں اور ایک مقررہ میعاد میں

انہیں قرآن و حدیث کے منتخب حصص کا درس بھی دیا جائے اور ایک ایسی دینی فضا بھی ہتیا کی جائے جس میں ان کے دینی جذبات بھی از سر نو تروتازہ ہوں اور ایک خاص اسلامی زندگی بسر کرنے کا عملی تجربہ بھی حاصل ہو جائے۔

قرارداد کے بنیادی نکات میں سے دوسرا اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ —
 ”دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک الدِّينُ النَّصِيحَةُ“ کی رُوح اور اَلْأَقْرَبُ فَالْأَقْرَبُ کی تدریج ضروری ہے۔ پیش نظر اجتماعیت لازماً یہ چاہے گی کہ اس کا ہر شریک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں داعی الی اللہ اور اپنے ماحول میں حسبِ مقدور و صلاحیت اور بقدر تمہت و استطاعت ہدایت کا ایک روشن چراغ بن کر رہے اور اس کی شخصیت پر بحیثیت مجموعی داعیانہ رنگ غالب ہو جائے۔

اس دعوت کا اصل محرک ابنائے نزع کی ہمدردی اور نصیح و نیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہیے اور اس میں نہ تو اپنی شخصیت کی نمود کا کوئی شانہ شامل ہونا چاہیے نہ طلب جاہ کا۔ حتیٰ کہ اللہ، رسول اور شریعت کی وفاداری کے جذبے کے تحت اگر کبھی کسی فرد، گروہ یا ادارے پر تنقید کی نوبت آجائے تو اس میں بھی ہمدردی اور دلسوزی غالب رہے اور ذاتی رنجش یا انتقام نفس کا کوئی شانہ نہ پیدا ہونے پائے۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ — ہمارے معاشرے کا مجموعی مزاج اگرچہ دین سے بہت دور جا چکا ہے اور اس اعتبار سے انتہائی اصلاح طلب ہے لیکن دعوت و اصلاح کے عمل میں دو حقائق کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یہ معاشرہ ایک مجموعی اکائی ہے اور اس کے تمام طبقات میں انحطاط سرایت کر چکا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے مختلف طبقات میں کیفیت کا تصور ابہت فرق چاہے موجود ہو کوئی بنیادی امتیاز موجود نہیں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ انحطاط براہ راست نتیجہ ہے جذباتِ ایمانی کے ضعف اور کتاب و سنت کے علم کی کمی کا۔ اس میں دین دشمنی کا عنصر

چند ایسی آشنائی صورتوں کے سوا موجود نہیں ہے جو اگرچہ بجائے خود تو بہت خطرناک ہیں اور ان سے خبردار رہنے کی بھی ضرورت ہے تاہم مجموعی اعتبار سے ہمارے معاشرے کے عام بگاڑ کا اصل سبب دین دشمنی نہیں بلکہ دین سے لاعلمی ہے۔ حکومت اس معاشرے کا جامع عکس اور باب اقتدار اس کا اہم جزو ہیں۔ ان کو اپنی اہمیت اور معاشرے میں اثر و نفوذ کی قوت و صلاحیت کے اعتبار سے دعوت و مخاطب میں اولیت تو دی جاسکتی ہے اور دی جانی چاہیے لیکن انہیں دین کا دشمن قرار دے کر ان کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرنے کے لیے عوام کے دینی جذبے کو مشتعل کرنا دراصل حالیکہ خود عوام کی ایک عظیم اکثریت کا حال دین سے بے خبری اور عملی بُعد کے اعتبار سے خود کم و بیش وہی ہے جو اصحابِ قوت و اختیار کا نہ ان کی خیر خواہی ہے نہ خود دین کی۔ رہا اقتدار کے حصول کی خاطر برسرِ اقتدار طبقے کے مخالف و معاند کی حیثیت اختیار کرنا تو یہ ہمارے نزدیک دینی نقطہ نگاہ سے نہایت مضری نہیں سخت مہلک ہے جس سے کئی اجتناب لازمی و لا بدی ہے۔ ہمارے نزدیک "اُمَّةُ الْمُسْلِمِينَ" اور "عاقبتہم" دونوں ہی نصیح و خیر خواہی کے برابر سخن اور دعوت و اصلاح کے یکساں محتاج ہیں!

یہاں یہ تصریح بھی ضروری ہے کہ ہماری دانست میں انتخابات کے ذریعے عمومی اصلاح کا نظریہ زری خام خیالی پر مبنی ہے، بحالاتِ موجودہ تو اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ انتخابات کے ذریعے اصلاح کی اُمید کی جائے۔ ویسے بھی ہماری رائے میں انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مخالف و متقابل کی حیثیت سے شرکت، دعوت و اصلاح کے صحیح بیج کے منافی ہے اور اس سے قبولِ حق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

داعی کے قلب میں اپنے اپنا نئے نوع کے لیے جس ہمدردی اور نصیح و خیر خواہی

کا ہونا لازمی ہے، اسی کا ایک اہم مظہر رافت و رحمت اور شفقت و رقت کا وہ جذبہ ہے جو انسانے نوع کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور عملی زندگی میں خدمتِ خلق اور ایثار و انفاق کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ دعوتِ دین اور خدمتِ خلق کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں بلکہ بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین کا وہ داعی جو خادمِ خلق نہ ہو اپنی دعوت میں دولتِ اخلاص سے محروم ہے۔ اس ضمن میں یہ فرق البتہ ضرور پیش نظر رہنا چاہیے کہ خدمتِ خلق کی اجتماعی سکیموں کو زیرِ عمل لانا بالکل دوسری بات ہے اور افراد میں خدمتِ خلق کے جذبے کا پیدا ہونا اور بڑھنا بالکل دوسری چیز ہے خدمتِ خلق کی اجتماعی سکیموں کی اہمیت اپنی جگہ کتنی ہی مسلم ہو، دعوتِ دین کے نقطہ نظر سے اصل مطلوب افراد کے قلوب میں شفقت و رحمت کے جذبے اور عمل میں ایثار و انفاق کی کیفیت کا ظہور ہے۔ پیش نظر اجتماعیت میں اصل زور انشاء اللہ اسی پر دیا جائے گا!

دعوت کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کا مخاطب لازماً ایک تدریج کے ساتھ داعی کے اپنے نفس سے شروع ہو کر (عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ) اپنے اہل و عیال (قُوا أَنْفُسَكُمْ وَ أَهْلِيكُمْ نَارًا) اور کنبے قبیلے (وَ أَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ) سے ہوتے ہوئے اپنی قوم (يَقَوْمًا عِبُدُوا اللَّهَ) اور پھر لوہری انسانیت (لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) تک پہنچنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک یہ صورت کہ داعی اپنے آپ کو بھول جائے اور بر و تقویٰ کی ساری دعوت دوسروں کو دیتا رہے (أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ) یا اپنے خاندان اور کنبے قبیلے کو تو بھول جائے اور دُور دراز کے لوگوں میں ہدایت کی سوغات بانٹنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو، نہایت خطرناک مرض کی علامت ہے۔ دعوت کے عمل کا صحیح نہج یہ ہے کہ الْأَقْرَبُ فَأَلْقُرْبُ

کے اصول پر آگے بڑھے اور جس سے جتنی قربت اور محبت داعی کو ہو دعوتِ تخطیب میں اسی قدر اسے مقدم رکھا جائے۔ اس سلسلے میں یہ خیال البتہ صحیح نہ ہوگا کہ ایک مرحلے کی تکمیل کے بعد ہی دوسرا مرحلہ شروع کیا جائے۔ مطلوب صرف یہ ہے کہ دعوت کے عمل کو ایک فطری تدریج اور حسین تناسب کے ساتھ اپنی ذاتِ اہل و عیال، کنبہ قبیلے اور پھر عوامِ اناس تک بڑھنا چاہیے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنی اولاد اور فی الجملہ نئی نسل کے بارے میں خصوصی توجہ و اہتمام سے کام لینا ہوگا اس لیے کہ ان کے بارے میں ہم حدیثِ نبوی ﷺ راجع و مکتومہ مَسْئُولٍ عَنْ رَجَائِهِ... الخ کی رو سے براہِ راست مسئول اور ذمہ دار ہیں۔ اولاد کی دینی تعلیم و تربیت کا یہ اہتمام ذاتی و انفرادی بھی ہوگا اور جہاں جہاں ممکن ہوگا اور وسائل دستیاب ہو سکیں گے اس امر کی سعی بھی کی جائے گی کہ ایسے مدارس اپنے اہتمام میں قائم کیے جائیں جن میں نئی نسل کے قلوب و اذان میں ایمان کی تخم ریزی و آبیاری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔

وسائلِ دعوت کے ضمن میں کوئی تعین غیر ضروری ہے۔ حسبِ صلاحیت و استعداد انفرادی و جمعی گھنگو، خطاب ہائے عام، خطباتِ جمعہ اور درسِ قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کے تمام جدید طریقوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے!

قرارداد کا تیسرا اہم نکتہ ”عامتہ اناس کو دین کی دعوت و تبلیغ“ کی اس ذمہ داری سے بحث کرتا ہے جو اُمتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے۔ ”ہمارے نزدیک انذار و تبشیر، دعوت و تبلیغ اور شہادتِ حق علی الناس کی جو ذمہ داریاں انبیائے کرام علیہم السلام پر عائد ہو کر تھی، وہ اب حضورِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوتِ رسالت کے ختم ہو جانے کے بعد آپ کی اُمت پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہیں۔ اول اول اس

امت نے "خلافتِ علیٰ منہاج النبوۃ" کے نظام کے تحت اپنی اس ذمہ داری کو اجتماعی حیثیت سے ادا کیا۔ خلافتِ علیٰ منہاج النبوۃ کے خاتمے کے بعد بھی ایک عرصے تک مسلمان حکومتیں اس فرض منصبی کو ادا کرتی رہیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اقلیاء و صلحا ذاتی طور پر دور دراز علاقوں میں پہنچ کر دین کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ اور عرصے سے یہ سلسلہ بھی تقریباً ختم ہو چکا ہے اور امت مسلمہ بحیثیت مجموعی "کمانِ حق" کے جرم کی مرتکب ہو رہی ہے اور صورتِ حال یہ ہے کہ امت کی تمام اجتماعی سرگرمیاں صرف اپنے دفاع اور ذیوی ترقی و استحکام تک محدود ہیں۔ کچھ تھوڑا بہت دینی رنگ کسی اجتماعی سرگرمی میں ہے بھی تو وہ محض امت کی داخلی اصلاح کی حد تک ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال سخت تشویشناک ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ اخروی باز پرس کا اندیشہ ہے، بلکہ ہماری رائے میں ہماری ذیوی نجات و ذلت کا اہل سبب بھی یہی ہے!

اس ضمن میں ہمارے نزدیک اس وقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ ایک طرف ادیانِ باطلہ کے مزعوم عقائد کا نوثر و مدلل ابطال کیا جائے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ و فکھ اور اس کے لائے ہوئے زندگی و الحاد اور مادہ پرستی کے سیلاب کا رخ ٹھٹھنے کی کوشش کی جائے اور محنتِ قرآنی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست جوابی علمی تحریک برپا کی جائے جو توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی حقائق کی حقانیت کو بھی مبرہن کرے اور انسانی زندگی کے لیے دین کی رہنمائی و ہدایت کو بھی مدلل و مفصل واضح کر دے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے حلقے میں نئی اقوام کا داخلہ، اور جسدِ دین میں نئے خون کی پیدائش ہی نہیں، خود اسلام کے موجود الوقت حلقہ بگوشوں میں حرارتِ ایمانی کی تازگی اور دین و شریعت کی عملی پابندی اسی کام کے ایک نوثر حد تک تکمیل پذیر ہونے پر موقوف ہے، اس لیے کہ وہ جسدِ دین کے گمراہ کن افکار و نظریات کے سیلاب میں خود مسلمانوں کے ذہن

اور تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد اس طرح بہہ نکلی ہے کہ ان کا ایمان بالکل بے جان اور دین سے ان کا تعلق محض برائے نام رہ گیا ہے اور اسی بنا پر دین میں نئے نئے فتنے اُٹھ رہے ہیں اور ضلالت و گمراہی نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔

اس سلسلے میں انفرادی کوششیں تو اب بھی جیسی کچھ بھی عملاً ممکن ہیں جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گی۔ ضرورت اس کی داعی ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو وسائل فراہم کیے جائیں اور ایک ایسے باقاعدہ ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو حکمت قرآنی اور علم دینی کی نشر و اشاعت کا کام بھی کرے اور ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا بھی مناسب اور موثر بندوبست کرے جو عربی زبان، قرآن حکیم اور شریعت اسلامی کا گہرا علم حاصل کر کے اسلامی عقائد کی حقانیت کو بھی ثابت کریں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات اسلام نے دی ہیں انہیں بھی ایسے انداز میں پیش کریں جو موجودہ اذہان کو اپیل کر سکے۔ آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیش نظر تنظیم ہرگز ۱۳ جماعت کے حکم میں نہ ہوگی۔ الجماعۃ کا مقام ہماری دانست میں اُمت مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ پیش نظر اجتماعیت کی حیثیت مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کی ہوگی جس میں وہ لوگ شریک ہوں گے جو خود اصلاح نفس اور تعمیر سیرت کے خواہش مند ہوں اور ان جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہیں جو دین کی جانب سے ان پر عائد ہوتی ہیں تاکہ ایک طرف ان کا باہمی تعاون ایک دوسرے کے لیے بہا رہا بن سکے اور دوسری طرف اصلاحِ مشاعر کے لیے ایک مؤثر قوت فراہم ہو جائے۔ دین کی خدمت نہایت وسیع و عظیم کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ ان کے ساتھ ہمارا روادیتہ تعاون و تائید ہی کا ہوگا۔ اپنے فہم و فکر کے مطابق ہم بھی دین کی خدمت کی ایک ادنیٰ کوشش کے لیے جمع ہو رہے ہیں اور یہ توقع کر کے میں اپنے

آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ دین کے تمام خادم ہیں اپنے رفیقِ راہ ہی گردانیں گے۔ اس تصریح کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ہم واقعہً تمام دینی عناصر خصوصاً علمائے کرام کے تعاون کی شدید احتیاج محسوس کرتے ہیں۔

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝

تقریر مولانا امین احسن اصلاحی

خطبہ مسنونہ کے بعد

بجائیو اور دوستو!

ایک طویل مدت کے بعد ہم خیالِ دوہم مقصد دوستوں کی صحبت جو میسر آئی ہے تو معلوم نہیں دل کے کتنے گوشے ہیں جن کے درپے کچھ کھل گئے ہیں اور کتنے سونے ہوئے خیالات ہیں جو جاگ پڑے ہیں مظاہر ہے کہ ان ساری باتوں کو ایک صحبت میں کہہ ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ یہ تو جب بھی کہی جائیں گی مختلف قسطوں ہی میں کہی جائیں گی۔ اس وقت تو صورتِ حال یہ ہے کہ ہرگز انہیں بل رہا ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ کیا بات کہی جائے، کیا نہ کہی جائے اور شروع کر کے بات کہاں ختم کی جائے، اس انجمن کی وجہ سے آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں گنگو صرف اس قرار داد کی وضاحت تک محدود رکھوں جو اپنے پورے مال، اور ماعلیہ کے ساتھ آپ کے سامنے آچکی ہے۔

اس قرار داد کی وضاحت کرنے میں اس وجہ سے نہیں اٹھا کہ اس میں کوئی اہم نامِ جاہل ہے۔ یہ اپنے مقصد و مفہوم میں بالکل واضح ہے جس طرح میں نے اس کو سمجھا لیا ہے اسی طرح آپ نے بھی اس کو اچھی طرح سمجھا لیا ہے۔ میری اس وضاحت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس میں جو نصب العین اور جو طریقہ کار اپنانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے بعض دلائل آپ کے سامنے عرض کروں تاکہ اس کی پوری اہمیت آپ کے سامنے آجائے۔

ہم نے اس قرارداد میں اللہ کا نام لے کر ایک ایسی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا ہے؛ جو دین کی جانب سے عائد کردہ مجملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآہونے میں اہلی مدد کرے! — قرارداد کا یہ مجملہ دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک اس حقیقت کی طرف کہ آپ تنظیم کو بجائے خود غایت و مقصد نہیں سمجھتے بلکہ اس کو صرف دین کی عائد کردہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اپنے لیے مُتَد و معاون سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس بات کی طرف کہ آپ اپنا نصب العین دین کو سمجھتے ہیں۔ اور اس دین کو اپنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں پر حاوی مانتے ہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ درحقیقت ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہی ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے لیکن قائم ہو جانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں، اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے۔ آپ کو اس خطرے سے ہر قدم پر ہوشیار رہنا ہے۔ اس چیز نے نہ صرف جماعتوں اور تنظیموں کو تباہ کیا ہے؛ بلکہ ملتوں اور امتوں کو بھی بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اس تغیر کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ اصل مقصد غائب ہو جاتا ہے بلکہ مقصد وسیلہ اور ذریعہ کا ایک ادنیٰ غلام اور چاکر بن کے رہ جاتا ہے۔ پھر تنظیم مقصد کی خدمت نہیں کرتی بلکہ مقصد کو اپنی خدمت اور اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہے۔ مذہب کے نام قائم ہونے والی جماعتوں کے لیے یہ چیز خاص طور پر خطرناک ہے؛ اس لیے کہ جب اس طرح کی کوئی جماعت خود اپنے وجود اور اس کے قیام و بقا کو مقصد بنا لیتی ہے تو وہ مذہب کی بھی جن چیزوں کو اپنے اس مقصد کی راہ میں مزاحم پاتی ہے؛ ان کو بدل کر اپنے جماعتی اغراض کے سانچہ میں ڈھال لیتی ہے۔ مذہب کی تاریخ ایک ساتھ شہادت دیتی ہے کہ اس چیز نے بے شمار تحریکات کی راہیں کھولی ہیں اور اس سے بڑے فتنے ظہور میں آئے ہیں۔ اس خطرے کے پیش نظر اس قرارداد میں اس امر کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے کہ تنظیم کو بجائے خود غایت و مقصد نہ بننے پائے بلکہ وہ اصل مقصد کے وسیلہ و ذریعہ کی حد تک محدود رہے۔ قرارداد کے اس پہلو پر بہت سی باتیں کہنی ہیں جو آگے کے مراحل میں بتدریج آپ کے سامنے آئیں گی۔ اس کے لیے لازماً اس تنظیمی ڈھانچہ میں ایسی

عد بنیدیاں کرنی پڑیں گی جو اس کو بے راہروی اور گمراہی سے محفوظ رکھیں۔

جہاں تک دوسری چیز یعنی دین ہی کو نصب العین بنانے کا تعلق ہے یہ کم از کم ہمارے اور آپ کے لیے محتاج دلیل نہیں۔ ہم خدا کے فضل سے مسلمان ہیں، اور ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ انسانیت کی اصل ترقی و فلاح مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔ مذہب کے بغیر انسان بس ایک ترقی یافتہ حیوان ہے، جیسا کہ نظریہ ارتقاء کے قائلین کہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایک حیوانِ نالائق جیسا کہ ارسطو نے انسان کی تعریف کی ہے۔ ہم ان دونوں میں سے کسی تعریف کو بھی انسان کی صحیح تعریف نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک انسان ایک رُوحِ یزدانی کا حامل ہے جیسا کہ قرآن نے: **وَقَدْ خَلَقْتَهُمْ مِنْ تَرْتُوبٍ**؛ کے الفاظ سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہی رُوحِ یزدانی ہے جو انسان کا شرفِ خصوصی ہے اور اسی کی بدولت انسان سجدِ ملائک بنا ہے۔ یہی رُوحِ ملکوتی اگر انسان کی رُوحِ بھیمی پر غالب رہے تو انسان حقیقی انسان ہے ورنہ وہ بس دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اس رُوحِ ملکوتی کے رُوحِ بھیمی پر غالب رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کے ادا سے کی باگِ خدا کی شریعت کے ہاتھ میں ہو۔ اگر انسان کا ارادہ شریعت کے ہاتھ میں نہ ہو اور اس کی عقلِ خدا کی وحی سے رہنمائی حاصل نہ کرے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کپڑوں میں ملبوس ایک جانور ہے۔ یہ جانور گدھا بھی ہو سکتا ہے، گنا بھی ہو سکتا ہے اور بند راہ اور خنزیر اور ایک غوغاک درندہ بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے شریعت سے بے قید انسانوں کو مذکورہ تمام جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تشبیہ محض برائے تشبیہ نہیں ہے بلکہ اظہارِ حقیقت ہے۔ اگر ہمارے پاس حقیقت کو دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ہمارے متمدن شہروں میں کپڑوں میں ملبوس کتنے چرپائے اور درندے انسانوں کے ہمیں میں پھر رہے ہیں۔ اور اس معجز اجزی پر قوموں کی قومیں ہیں جو متمدن کہلانے کے باوجود اپنی سرشت کے اعتبار سے درندوں سے زیادہ سفاک اور خونخوار بن گئی ہیں۔

ہمارے لیے شریعت کے انتخاب کا معاملہ بھی کوئی پھیچیدہ معاملہ نہیں ہے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام تمام دنیا کا مشترک دین ہے اور قرآن خدا کی آخری اور کامل کتاب اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول ہیں۔ اس وجہ سے یہ عین ہمارے عقیدے کا تقاضا

ہے کہ ہم اپنی زندگی اسلام کے احکام و ہدایت کے تحت گزاریں اور اسی کی دعوت و دوسروں کو بھی دیں۔

یہ دوسروں کو دعوت دینا بھی عین ہماری فطرت بشری کا اقتضار اور ہماری اپنی اصلاح اور ترقی کا لازمہ ہے۔ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ انسان تنہا نہیں پایا جاتا وہ ایک منی الطبع ہستی ہے۔ وہ کسی خاندان کے فرد، کسی قبیلہ کے رکن، کسی شہر کے شہری اور کسی ملک کے باشندے کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے لیے وہ ان سب باتوں کا محتاج ہے۔ اسی بنا پر انسان کو Social Animal کہا گیا ہے۔ جس طرح مچھلی پانی سے مستغنی نہیں ہو سکتی، اسی طرح انسان معاشرے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اگر انسان معاشرہ سے بے تعلق ہو کر اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر اجاگر کر سکتا تو اسلام رہبانیت کی مخالفت نہ کرتا۔ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نباتات میں سے Creepers سے مشابہ ہے۔ جس طرح انگور کی بیل صحیح طور پر اسی طرح پروان چڑھتی ہے جب اس کو کوئی سہارا ملے۔ بغیر اس سہارے کے وہ سکر کے رہ جاتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی صحیح طور پر اسی طرح پروان چڑھتا ہے جب اس کو معاشرے کا سہارا ملے بغیر اس سہارے کے اس کی صلاحیتیں سکر کے رہ جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ یہ سہارا اس کے روحانی تقاضوں کے موافق ہو۔ جس طرح انگور کی بیل اس سہارے کے اثرات میں سے جتنی لیتی ہے جس پر وہ چڑھتی ہے، اسی طرح انسان اس معاشرے کے خیر و شر سے متاثر ہوتا ہے، جس میں زندگی گزارتا ہے۔ انگور کی بیل کو نیم پر چڑھا دیجئے تو اس کے پھل کڑوے کیلے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان اگر بُرے معاشرے میں زندگی گزارے تو وہ بُرا بن سکتا ہے۔

انسان کی اس فطرت نے اس کے لیے ایک سخت مشکل پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف تو اس کی فطرت کی رُو سے یہ واجب ہے کہ وہ اپنے لیے سازگار معاشرہ تلاش کرے اور اگر معاشرہ سازگار نہ ہو تو اپنے روحانی و اخلاقی تقاضوں کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ اس کو سازگار بنانے کی جدوجہد کرے۔ اگر کوئی شخص یہ جدوجہد نہ کرے تو اس کی اخلاقی و روحانی موت یقینی ہے۔

اگرچہ کوئی شخص کسی دوسرے کی اصلاح پر اختیار نہیں رکھتا، دوسرے کی اصلاح اللہ کی توفیق پر منحصر ہے، لیکن ہر شخص خود اپنی اصلاح کے لیے اس جذبہٴ جہد پر اپنے امکان اور اپنی صلاحیتوں کی حد تک کام کرے۔

اس وجہ سے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے جو شخص کوئی بڑائی دیکھے اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرے، اگر اس کی قدرت رکھتا ہو، اگر ہاتھ سے اس کی اصلاح کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے، اگر اس کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر اس کی بھی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو ادنیٰ درجہ کا ایمان یہ ہے کہ اس کو دل سے بڑا جانے (یعنی اس میں کسی نوعیت کا بھی تعاون نہ کرے!) اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

معاشرہ سے متعلق افراد کی ذمہ داریوں کو واضح کرنے کے لیے حضورؐ نے معاشرہ اور افراد کو ایک کشتی کے مسافر سے تشبیہ دی ہے۔ ایک کشتی میں کچھ لوگ عرشے پر سفر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کے نیچے کے حصے میں۔ فرض کیجئے نیچے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں پانی لینے کے لیے اُپر جانے کی شفقت اٹھانی پڑتی ہے، کیوں نہ ہم اپنے حصے میں کشتی کے پیندے میں سوراخ کر لیں اور اُوپر والے یہ خیال کر کے کہ وہ اپنے حصے کی کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں ان کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سوراخ کرنے کے لیے ان کو آزاد چھوڑ دیں تو سوراخ ہو جانے کے بعد کشتی جو ڈوبے گی تو اُوپر والوں اور نیچے والوں سب کو لے کر ڈوبے گی یہی حال معاشرے کا ہے، اس میں اچھے بھی ہوتے ہیں، بُرے بھی ہوتے ہیں۔ اگر اچھے لوگ معاشرہ کے خیر و شر سے بے تعلق ہو جاتے ہیں تو بُروں کی بڑائی سے جو آفت ظہور میں آتی ہے اس میں اچھے اور بُرے دونوں ہی حصہ پاتے ہیں۔

حدیثوں میں ایک بستی کا اجرامی بیان ہوا ہے، جس سے یہ حقیقت مزید واضح ہوتی ہے۔ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کے متعلق فرشتہ کو حکم دیا کہ جا کر اُس کو اُلٹ دو۔ فرشتہ نے عرض کی کہ باری تعالیٰ اس میں تو تیرا ایک ایسا بندہ بھی ہے جو برابر تیری عبادت میں لگا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کے سمیت بستی کو اُلٹ دو، اس لیے کہ اُس کا چہرہ کبھی میرے دین کی

بے حشری پر غیرت سے تنہا نہیں۔

اس تفصیل سے چہیت واضح ہوتی کہ ہمارے لیے اپنے معاشرے کے خیر و شر سے بے تعلق رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، نہ ہماری فطرت اس بے تعلقی کی زوآدار ہے نہ ہمارا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے۔ دوسروں کی اصلاح سے قطع نظر ہم خود اپنی اصلاح و فلاح کے لیے اس بات کے محتاج ہیں کہ اپنے معاشرے کو اپنے روحانی و اخلاقی تقاضوں کے لیے سازگار بنانے کی کوشش کریں۔ اس کوشش سے دوسروں کی اصلاح ہو یا نہ ہو، لیکن ہماری اصلاح ہوگی اس سے ہماری اپنی صلاحیتیں پروان چڑھیں گی اور ہماری اپنی فطرت کے مضمرات بروئے کار آئیں گے۔ جو شخص یہ کام کرتا ہے وہ خود اپنا فرض انجام دیتا ہے اور دوسروں سے زیادہ وہ خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص یہ فرض انجام دیتا ہے تو اس کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو معاشرہ کا محسن سمجھنے لگے بلکہ وہ یہ سمجھے کہ اُس نے اپنا ہی فرض انجام دیا ہے جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ خود اپنے اوپر احسان کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم معاشرہ کی کسی بُرائی کی اصلاح کرتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ صرف اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ دین میں دوسروں کے نیک و بد سے متعلق ہم پر جو ذمہ داری عائد کی گئی ہے وہ ہمارے ذاتی فرض ہی کی حیثیت سے عائد کی گئی ہے۔

زیر بحث قرارداد میں یہ تصور اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے اور اس کے دو بڑے اہم فوائد ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کوئی شخص دعوت و اصلاح کا کوئی کام کرتے ہوئے یہ نہیں سمجھے گا کہ وہ کسی دوسرے کا کام کر رہا ہے، بلکہ وہ یہی سمجھے گا کہ اپنا ہی کام کر رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ کوئی شخص دوسروں کی اصلاح میں اتنا مستغرق نہیں ہوگا کہ وہ خود اپنی اصلاح سے غافل اور بے پروا ہو جائے۔ یاد رکھیے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دوسروں کی اصلاح کی کوشش اصلاً خود اپنی ہی اصلاح کی کوشش کا ایک جھنڈ ہے جو شخص دوسروں کی اصلاح میں رات دن سرگرم رہتا ہے لیکن اسے خود اپنی اصلاح کی فکر نہیں ہے، وہ محض ناماشی مصلح ہے جو خود جنگ رہا جو وہ دوسروں کی رہبری نہیں کر سکتا۔ انگریزی وہ بیل سوکھ جاتی ہے جس کی اپنی جڑ اکھڑی ہوتی ہو، اگرچہ اس کو کتنے ہی خوبصورت ہمارے پر چڑھا دیجئے۔ اس زمانے میں چونکہ زیادہ تر مدعیان اصلاح ایسے ہی ہیں جنہیں

خود اپنے دین و ایمان کا کچھ ہوش نہیں لیکن دوسروں میں دین کی سوغات بانٹنے کے لیے نفعی ترقی کا سفر کرتے پھرتے ہیں، اس وجہ سے ضروری ہے کہ اہل فتنہ پر لوگوں کی توجہ مرکوز کرانی جائے۔ چنانچہ قرارداد میں اس حقیقت کو یوں واضح کیا گیا ہے کہ: "ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فر ہے۔ اسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات دین کا اصل موضوع ہے اور پیش نظر اجتماعیت اصلاحی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رخصتے الہی کے حصول میں مدد دے۔ اس تصور کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ اس تنظیم کا ڈھانچہ ایسا بنایا جائے کہ وہ اپنے اعضاء و ارکان کی اصلاح و تربیت کا ایک جامع ادارہ بن جائے۔ اس عزم کا اظہار قرارداد میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"لہذا پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں فرد کی دینی و اخلاقی تربیت کا کما حقہ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکات کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادت اور اتباع سنت سے ان کا ذوق و شوق بڑھا چلا جائے، عملی زندگی میں حرام و حلال کے بارے میں ان کی حس تیز اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مستی برقعوی ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لیے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے؛

ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے تنظیم کیا وسائل و ذرائع اختیار کرے گی، اس کا جواب دینا بروقت میرے لیے مشکل ہے۔ اس کا جواب بہت کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس تنظیم کو کن صلاحیتوں کے افراد حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنی مجموعی کوشش سے کیا اسباب و وسائل فراہم کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ اس افراد اور وسائل کی وسعت کے ساتھ ساتھ امکانات کا جائزہ لینا، اور ان کے مطابق قدم اٹھانا تنظیم کے ارباب حل و عقد کا کام ہے لیکن اتنی بات بے بیسی ہے کہ اس مقصد کے بروئے کار لانے میں اس امر کی پوری کوشش کی جائے گی کہ جو قدم سبھی اٹھے اسوۂ انبیاء کی روشنی میں اٹھے، اور جماعت کی تربیت اس پنج پر ہو جس کی طرف کتاب و سنت میں رہنمائی کی گئی ہے۔

ہم اپنی تربیت کے لیے سب سے پہلے تو صحیح علم کے محتاج ہیں صحیح علم سے میری مراد دین کا علم ہے۔ اس زمانے میں دین کا علم عفا ہو رہا ہے اس کے حصول کے لیے وسائل ذرائع

بھی روز بروز کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں اور لوگوں کے اندر اس کی رغبت بھی بالکل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اگر دین کا علم ہی مٹ گیا تو چھوڑ دین کے باقی رہنے کا کیا امکان ہے، یہ امر بھی بدیہی ہے کہ اس زمانے میں دین کا رواجی علم بالکل غیر مفید ہے۔ یہ زمانہ عقلیت کا زمانہ ہے اس زمانے میں لوگ ہر چیز کی دلیل و محبت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مجروریہ بات لوگوں کو اپیل نہیں کرتی کہ فلاں بات دین کی بات ہے۔ دین پر آج جو اعتراضات ہو رہے ہیں وہ کل کے اعتراضات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ اعتراضات جدید مغربی فکر و فلسفہ کی پیداوار ہیں اور ان کو زور و وقت کے ساتھ پھیلائے والے خود ہمارے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔ جب تک ان اعتراضات و شبہات کا موثر ازالہ نہ ہو اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ آپ دین کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں افسوس ہے کہ اس خدمت کی صلاحیت رکھنے والے آج ہمارے اندر اگر مفقود نہیں تو اتنے کم ہیں کہ وہ دین کے محاذ کو کسی طرح بھی سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے عالمان دین پیدا کرنے کی موثر جدوجہد کی جاتے جو جدید علوم و افکار سے بھی کما حقہ آگاہ ہوں اور کتاب و سنت کے دلائل و براہین پر بھی وہ براہ راست نظر رکھتے ہوں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہمارا دین دنیا میں بے دلیل نہیں آیا ہے۔ وہ بہتر سے بہتر فطری و عقلی دلائل سے مسلح ہو کر آیا ہے جو ہر دور کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہیں، بشرطیکہ ان کو اجاگر کرنے والے اور ان کو دنیا کے سامنے حالات کے مطابق پیش کرنے والے موجود ہوں۔ دوستو! یہ کام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس قسم کے افراد صرف اردو میں کبھی ہوتی چند کتابیں پڑھ لینے سے نہیں پیدا ہوں گے، بلکہ اس کے لیے کتاب و سنت اور علوم اسلامیہ سے براہ راست گہری واقفیت ضروری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی صلاحیت ہم میں سے ہر شخص اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتا، لیکن معتد بہ تعداد ہمارے اندر جب تک ایسے لوگوں کی نہ ہو گی ہم ان ذمہ داروں سے کما حقہ عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے جو دین سے متعلق اس زمانے میں ہم پر عائد ہوتی ہیں۔

جہاں تک عاتر المسلمین کو دین کی دعوت دینے کا تعلق ہے اس کے بارے میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اس زمانے میں مجروریت کی کافی نہیں ہے، بلکہ وسیع پیمانے پر تعلیم و تعمیر

کی ضرورت ہے۔ یہ صورت نہیں ہے کہ لوگ دین کی باتیں بھولے ہوئے ہیں، اگر انہیں یاد دلا دی جائیں تو وہ ان کو اختیار کر لیں گے، بلکہ اشاعتِ باطل کے وسیع ذرائع نے اس زمانے میں عام اذہان کے اندر بھی دین اور دینی احکام سے متعلق بے شمار غلط فہمیاں بھری ہیں جن کو دور کرنے کا سامان کرنا ان لوگوں پر واجب ہے جو آج ملک کے عوام کی اس پہلو سے کوئی خدمت کرنا چاہتے ہوں۔ آج اخبارات گھر گھر پہنچ رہے ہیں۔ ریڈیو کھیتوں اور کھلیانوں تک موجود ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ زندگی کے جدید شیطانی نظریات سے ہمارے عوام بے خبر ہیں یا وہ ان سے بالکل بے تعلق ہیں۔ ان سے ناثر کے معاملے میں شہری اور دیہاتی آبادی میں کچھ فرق ہونا تو ایک قدرتی امر ہے لیکن دیہاتی آبادی کو ان فتنوں سے بالکل الگ تھلک خیال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کے اندر کام کرنے کے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو موجودہ حالات میں اُن کے لیے مؤثر اور مفید ہوں۔

جہاں تک ملک کے اربابِ اقتدار کا تعلق ہے اُن کے بارے میں بھی ہمارے ہاں سخت افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو ان کی اصلاح کے معاملے میں بالکل بے تعلق ہیں، انہیں اُن کے خیر و شر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اُن کے شر کو بھی خیر ہی کہنا پسند کرتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو اُن کے خیر کو بھی شر قرار دیتے ہیں۔ اور ہر حالت میں ان کی مخالفت کرنا اُن کے ہاں جزوِ ایمان ہے۔

آپ کی یہ قرارداد ان تینوں طریقوں کو غلط قرار دیتی ہے اور دین کی روشنی میں ایک چوتھا طریقہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ جہاں تک پہلے طریقے یعنی لائق تعلق کے رویہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کوئی پرایا جھگڑا نہیں ہے جس سے علیحدہ رہنے میں آدمی کے لیے سعادت ہو بلکہ ہم میں سے ہر شخص کے اپنے دین و ایمان کا معاملہ ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اللہ علیہ وسلم کی واضح تعلیمات کی روشنی میں بتا چکا ہوں کہ جو شخص معاشرہ کے خیر و شر سے بے پروا ہے وہ خود اپنے دین و ایمان سے بے پروا ہے۔ اور اُس کی یہ بے پروائی اُس کی ساری دینداری غارت کر کے رکھ دے گی۔ ہم جس کشتی پر سوار ہیں اپنے اسکان کی حد تک کسی کو اس کے پینڈے میں سوراخ کرتے ایک

مناشائی کی طرح نہیں دیکھ سکتے۔

دوسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ جو چیز غلط ہے اگر وہ ارباب اقتدار کی طرف سے ظہور میں آئے تو اُس کی غلطی اور بھی سنگین ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس کے اثرات بہت دور رس ہوں گے۔ اگر کوئی شخص اس غلطی کو صواب قرار دے تو یہ اُس پر خاموشی سے بھی بڑا جرم ہے۔ یہ رویہ اگر خوف یا طمع کی بنا پر اختیار کیا جائے تو اسلام میں صریح نفاق ہے، جو ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ اور اگر یہ اس بنیاد پر اختیار کیا جائے کہ اس سے حکومت کو ضعف پہنچتا ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ اول تو حکومت کو ضعف پہنچ سکتا ہے تو غلط چیز سے نہ کہ صحیح چیز سے، ثانیاً حکومت بجائے خود مقصد و غایت نہیں ہے، بلکہ اسلام میں وہ اللہ کے قانون عدل و قسط کا ذریعہ ہے۔ اس وجہ سے حکومت کی مصلحت کے لیے بھی کسی شر کو خیر قرار دینا اپنے دین و ایمان پر کھلم کھری لڑنا ہے۔ تیسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ ارباب اقتدار کی ہر بات کو ہدف تنقید بنا لینا یہاں تک کہ اُن کے خیر کو بھی شر قرار دینا اور اُس کی مخالفت میں اس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی بُرائیاں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دینا، عقل و منطق کی رو سے جائز ہے، نہ اسلام کی رو سے۔ یہ اقتدار کی جوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے، اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحیح بات بھی ارباب اقتدار کو اپیل نہیں کرتی۔ جن کی ذہنیت یہ بن جاتی ہے وہ خیر خواہی کے جذبے سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں۔ درانحالیکہ یہ جذبہ دعوت دین کی اصل روح ہے۔ اگر انسان خیر خواہی کے جذبے سے خالی ہو تو اُس کی ہر بات نفرت اور عناد کی غم بیزی کرتی ہے اور اگر وہ اس کے ساتھ دین کا نام لیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں ایک نفرت انگیز چیز بنا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں دین کو جو نقصان پہنچا ہے، وہ دین کے کھلے ہونے دشمنوں کے ہاتھوں بھی نہیں پہنچا ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی ایک نفسیاتی جنگ میں دین کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اس طرح بلاوجہ دین کو ان تمام لوگوں کے سامنے ایک حریف بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں، جن سے ان کی لڑائی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح کے لوگ انسانیت اور خلق کی محبت سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دل سے اس بات کے آرزو مند ہوتے ہیں کہ ملک میں زلزلے

آئیں، قحط پڑے، سیلاب آئیں، وہاں پھیلیں تاکہ یہ ان سب چیزوں کا دفتر دار حکومت کو ٹھہرا کر اپنے اقتدار کے لیے راہ ہموار کریں۔ ایسے بے درد اور سنگ دل لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ یہ دین کی کوئی خدمت انجام دے سکیں گے، محض خام خیالی ہے۔

آپ نے جو قرار داد پاس کی ہے اس میں آپ نے ان تمام طریقوں سے الگ اپنے لیے "الذین النصیحة" کی راہ اختیار کی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کے خیر و شر سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ یہ خیر خواہی کے خلاف ہے۔ اسی طرح آپ کسی کے شر کو خیر بھی نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ یہ بھی حق اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔ علیٰ ہذا لفظاً آپ کسی کی مخالفت کے جوش میں اس کی نیکی کو بدی نہیں ٹھہرا سکتے، اس لیے کہ یہ بھی سچائی اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ دین کو ہوس اقتدار کی جنگ میں ایک ہتھیار کے طور پر بھی استعمال نہیں کریں گے۔ بلکہ جس کے سامنے بھی اس کو پیش کریں گے، اللہ کے دین کی حیثیت سے پیش کریں گے، کہ اسی میں اس کی بھی جھلانی ہے اور اسی میں آپ کی بھی جھلانی ہے۔ یہی حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریق کار ہے اور یہی آپ کو اختیار کرنا ہے۔ رفیقو! میں سمجھتا ہوں کہ ایک واضح چیز کی وضاحت کرنے میں آپ کا بہت سادگی میں نے لیا۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور اپنے لیے اور آپ کے لیے دعا کرتا ہوں کہ ہم نے جو کچھ طے کیا ہے اس پر ہم عمل کرنے کی توفیق پائیں۔

أَقُولُ قَوْلِي هَذَا وَاسْتَغْفِرُ اللَّهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ!

عن تميم الداري رضى الله عنه

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال:

إِنَّ الدِّينَ النَّصِيحَةُ،

قُلْنَا: لِمَنْ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟

قال: لله، ولكتابيه، ولرسوله،

ولأئمة المسلمين، وعامتهم۔ (رواه مسلم)

تقریر مولانا عبدالغفار حسن

مدد ثنا کے بعد

رفقائے محترم!

صبح کے درس قرآن پھر قرار داد اور اس کی توضیح اور سب سے بڑھ کر مولانا اصلاحی کی تقریر سے معاملے کے اکثر پہلو اچھی طرح واضح ہو چکے ہیں اور اب میری تقریر کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، تاہم جو خدمت میرے سپرد ہے میں اس کی انجام دہی میں بعض باتیں آپ حضرات کے سامنے رکھتا ہوں تجرار سے بھی کم از کم تذکیر کا فائدہ تو حاصل ہو ہی جائے گا۔

ایک نئی دینی جماعت کے قیام کے فیصلے پر سب سے پہلے جو سوال ذہنوں میں پیدا ہونا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ آخر ایک نئی جماعت کی ضرورت کیا ہے؟ اولاً کیا انفرادی طور پر کام کرنا کافی نہیں ہے؟ ثانیاً اگر اجتماعیت لازمی ہے تو بھی ڈیڑھ اینٹ کی ایک نئی مسجد الگ بنانے کی کیا حاجت ہے؟ بہت سی دینی تنظیمیں اور جماعتیں موجود ہیں کیوں زبان میں سے کسی کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے؟

جہاں تک اجتماعیت کی ضرورت و اہمیت کا تعلق ہے اس پر مولانا اصلاحی بہت مفصل روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے علیحدہ علیحدہ کام کرنے اور ان سب کے مل کر اجتماعی طور پر کام کرنے میں نتائج کے اعتبار سے زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اجتماعیت میں ہر فرد ایک دوسرے کا سہارا اور ایک دوسرے کی کمی پورا کرنے والا ہوتا ہے جس سے کام میں عظیم برکت پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ نے مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں دی ہیں۔ کسی کو بولنے کی صلاحیت دی ہے، کسی کو لکھنے کی، کسی کو بھاگ دوڑ کی قوت دی ہے، کسی کو غور و فکر اور تدبیر و تفکر کی اسی طرح کسی کو علوم دینی سے سرفراز فرمایا ہے اور کسی کو معلومات دنیوی سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ کسی کو فہم قرآن کے بجز عمیق میں غوطے لگانے کی صلاحیت دی ہے تو کسی کو علوم حدیث کی دستوں میں پیرا کی کی صلاحیت سے نوازا ہے۔

کسی کو قہیم کی واقعیت عطا فرمائی ہے تو کسی کو جدید سے رُو شناس کیا ہے مختلف مصلحتوں اور قوتوں سے مسلح افراد کے مجتمع اور متحد ہو کر کام کرنے سے ہی اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ کوئی جامع اور سرگیر فوعیت کا کام سرانجام پاسکے پھر دین و مذہب کے مخالف اور لادینیت کے علمبرداروں کو دیکھتے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح منظم ہو کر کام کر رہے ہیں اور ان کے غلغلف گروہ اور جتنے مختلف اطراف سے پوری تنظیم اور اجتماعیت کے ساتھ دینی قوتوں پر یلغار کر رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اجتماعیت کا مقابلہ الفردیت سے نہیں کیا جاسکتا اس کے لیے اجتماعیت ہی کی ضرورت ہے۔ بنا بریں دینی قوتوں کا منظم و مجتمع ہونا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

بلشبہ جماعت سازی سے کچھ اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں مثلاً ایک یہ کہ اس سے جماعتی دگر وہی عصبیت پھر تعصب اور بالآخر تہرب و تفرق کی لعنت وجود میں آتی ہے دوسرے یہ کہ جماعتیں بالعموم شخصیتوں کے گرد گھومتی ہیں اور ان سے شخصیت پرستی کی ہلک بیماری پید ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ خود جماعتیں عموماً اعلیٰ انشاکا شکار ہوجاتی ہیں اور بعض اوقات اس کتنہائی کر یہ صورت حال پیدا ہوجاتی ہے۔

اس سلسلے میں اولین بات تو یہ ہے کہ ہر چیز کے مجموعی فائدے یا نقصان کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ بہت سے اچھے کاموں میں کوئی پہلو بُرا نہ کا ہو سکتا ہے اور بہت سی برائیوں میں کوئی پہلو اچھائی کا ہونا ممکن ہے۔ قرآن مجید نے خود شراب اور جوئے کے بارے میں بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ ان میں منفعت بھی ممکن ہے لیکن *وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ* ان کا شران کی منفعت سے زیادہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز میں خیر کا پہلو غالب ہو اس کو اختیار کرنا چاہیے اور اس کے شر سے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیے۔

شخصیت پرستی کی لعنت کے پیدا ہونے کے امکانات وہاں زیادہ ہوتے ہیں جہاں کسی ایک داعی کی دعوت پر لوگ جمع ہوں اور اسی کے خیالات و نظریات و تصورات اور اسی کے فہم و فکر کو اس اجتماعیت میں مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر ابتداء سے بہت سے لوگ باہمی مشاورت سے اپنے مقصد اور اس کے حصول کے طریق کو طے کریں اور

سلسلہ "امرہ شوریٰ بیٹھہ" کی قرآنی ہدایت پر عمل پیرا ہیں تو ان شاء اللہ اس
لغت کا سدباب ہو جائے گا۔

"تخریب اور تفرق" سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دین کی خدمت کے لیے
جمع ہونے والے لوگ ہمیشہ "اِنَّ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" ہی کو اپنا واقعی شعار بنائیں اور اپنے آپ
کو امت مسلمہ ہی کا ایک حصہ تصور کریں۔ چنانچہ زندان میں کوئی غرور و گھمنڈ پیدا ہونا اپنے وچیزے
وگر ہونے کا احساس پیدا ہونے پائے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں کے کسی اعتبار سے
بہتر و برتر تصور کریں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ تخریب اور تفرق محض جماعت سازی ہی سے
پیدا نہیں ہوتے بلکہ کوئی ادارہ یا محض درس گاہ یا دارالعلوم بھی ان کا سبب بن سکتا ہے اور واقعہ
یہ ہے کہ بنا ہے اور اس کی مثالیں خود ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو درس گاہ
نئی قائم ہوتی ہے وہ بالعموم کسی ایک خصوصیت کی حامل ہوتی ہے۔ نتیجہً اس سے فارغ ہونے
والے نوجوانوں کا مزاج ایک خاص رنگ میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے اور مرد و ایم کے ساتھ
اس کے فارغین و متولین میں گروہی و جزبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے تو یہ صحیح ہے کہ ان
خدشات کی بنا پر درس گاہیں اور دارالعلوم قائم کرنے بند کر دینے جاتیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ
دینی مقاصد کے حصول کے لیے ادارے یا جماعتیں قائم کرنا ممنوع قرار دے دیا جائے پس
کے برعکس دارالعلوموں اور اداروں کے قیام کے ساتھ حتی الامکان ایسی احتیاطی تدابیر اختیار
کی جانی چاہئیں کہ ان کے ذریعے امت میں تفرق و انتشار پیدا نہ ہو۔ اس سلسلے میں جس قدر
میں نے غور کیا ہے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک تو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے لوگوں میں
کچھ چیزے "وگر" ہونے کے احساس کو پیدا ہونے سے روکا جائے اور "اِنَّ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ"
کی قرآنی ہدایت کو ہمیشہ مستحضر رکھا جائے اور دوسرے یہ احتیاط کی جائے کہ عملاً جمعہ و جماعت
اور ربط و ضبط اور رشتوں ناطوں کے معاملات کو صرف ہم خیال لوگوں کے حلقے میں محدود کر کے
زحمان نہ پیدا ہو۔ ان تدابیر پر اگر عمل کیا جائے تو میری رائے میں کوئی دینی جماعت فرقے
میں تبدیل نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم!

جو ہماری رائے میں بعض کام بہت اچھے سرانجام دے رہی ہیں لیکن ان کے کاموں میں کچھ خلا ہے اور دین کے بعض تقاضے اس کے ذریعے پورے نہیں ہو رہے ہیں۔ ایسی جماعتوں کے ساتھ دو طرح کا معاملہ نظری اعتبار سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ ان کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے اور ان کے اندر رہ کر زور ڈالا جائے کہ دین کے دوسرے تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔ یہ طریق بظاہر بڑا معقول اور مستحسن نظر آتا ہے لیکن عملاً اپنے اندر بہت سی پیچیدگیاں رکھتا ہے۔ ہر جماعت کے خوشامین کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور ان کے ذہن کی ایک خاص ساخت ہوتی ہے جسے باسانی بدلنا نہیں جاسکتا، اور اگر بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کہ خواہ مخواہ کی کھینچ مان اور بدمزگی پیدا ہو اور ہاتھ کچھ نہ آئے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر ان کے نزدیک کوئی دوسرا پہلو اہم تر ہے تو وہ آپ کی وجہ سے کسی اور پہلو پر کیوں زیادہ زور دیں لہذا عملاً دو سراطیق ہی ممکن اہل بھی ہے اور بہتر بھی یعنی یہ کہ دوسرے لوگ ایک علیحدہ اجتماعیت قائم کریں اور اپنے ذہن و فکر اور اپنی صوابدید کے مطابق کام کریں۔ اب اگر خلوص اور اہمیت موجود ہے تو یہ دونوں کام ایک دوسرے کے معاون اور ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرنے والے بن جائیں گے اور اگر اخلاص کی دولت ہی سے یہی دامن ہو تو پھر بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جیسا تصادم اندر تھا ویسا ہی باہر بھی ہوگا۔ اس صورت میں بھی علیحدہ جماعت سازی پہلی صورت کے مقابلے میں زیادہ نقصان دہ تو کسی طرح نہیں ہو سکتی۔!

اب میں آپ کے سامنے اس نئی دینی تنظیم کے کچھ خصائص پیش کروں گا جس کے قیام کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ قرار داد میں بھی ہے اور ان کی توضیحات میں بھی۔ پھر مولانا اصلاحی بھی اپنی تقریر میں ان میں سے بعض کی وضاحت کر چکے ہیں۔ میں ان کو سلسلہ وار پیش کرتا ہوں تاکہ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کم از کم تذکیر ہو جائے:

پہلی خصوصیت ہمارے پیش نظر تنظیم کی یہ ہے کہ اس میں نصب العین کے مقام صرف نجات اور رضائے الہی کے حصول کو رکھا گیا ہے اور اس میں ایسی کوئی تفریق نہیں رکھی گئی کہ دنیا میں ہمارا مقصود یہ ہے اور آخرت میں یہ! — دنیا دار اہل ہے اور آخرت دار جہاں۔ دنیا میں انسان دین و شریعت کے مجملہ تقاضوں کو آخری جہاں کے لیے پورا کرتا ہے لہذا

ہر آن اور ہر لمحہ ہمارا نصب العین ایک ہی ہے اور وہ ہے آخرت کی کامیابی!! اور اس کے لیے دین کے جملہ انفرادی و اجتماعی تقاضوں کو اسی ترتیب و تدریج اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ پورا کرنا ضروری ہے جو خود نظام دین میں متعین ہے! ان میں سے کسی ایک تقاضے کو آہستہ دے کر نصب العین کے مقام پر لے آنا ہرگز صحیح نہیں ہے!

دوسری خصوصیت ہماری اس تنظیم کی یہ ہوگی کہ ہماری دعوت صرف اللہ اور اس کے عین کی طرف ہوگی کسی خاص شخصیت یا جماعت کی طرف ہوگی نہ کسی خاص مسلک یا فقہی مذہب کی طرف!

اسی بنا پر اس اجتماعیت کی تیسری خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ نہ کسی فرد یا گروہ کی عیض ہوگی نہ حریف۔ اس میں حُب اور بغض اور محبت و نفرت کا معیار صرف اللہ اور اس کا دین ہوں گے اور یہ کُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہونے کی مقدور بھر سچی کرے گی اور حتی الامکان کوشش کرے گی کہ ذاتی یا گروہی عصبیت یا تعصب کی بنا پر عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ لَا يَجْبِرُكُمْ شَيْئًا قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ لَا تَعْدُوا إِيَّاهُمْ وَأَنْتُمْ بِالْقِسْطِ۔ چنانچہ ہمارے لیے کسی حزب اختلاف کا تصور خارج از بحث ہوگا۔ مغربی جمہوریت کے پیدا کردہ ان تعصبات سے عدل و انصاف کے تقاضے پامال ہو جاتے ہیں اور انسان اپنی جماعت کے بُرے سے بُرے کام کی حمایت اور حزب مخالف کے اچھے سے اچھے کام کی مخالفت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پس نظر اسلامی تنظیم انشاء اللہ نَعَاوَنُوا عَلَى النِّيرِ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا نَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کے قرآنی احکامات پر عمل پیرا ہوگی۔

چوتھی خصوصیت ہماری اس اسلامی تنظیم کی یہ ہوگی کہ یہ طبقاتی تصور اور اس سے پیدا شدہ تنازع البقا کے بجائے وحدتِ الود آدم اور ترافق یا تعاون للبقا کے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے گی۔

پانچویں خصوصیت دینی مسائل اور ان سے متعلق اختلافِ مذاہب و مذاہب کے متعلق ہے۔ ہمارے نزدیک جملہ دینی مسائل تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو اساسی اور بنیادی بھی ہیں اور مستفق

علیہ بھی، دوسرے وہ جو متفق علیہ تو ہیں لیکن اساسی نہیں ہیں۔ اور تیسرے وہ مسائل ہیں جن میں سلف اور غیر القرون ہی سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ ہماری یہ تنظیم ان شاء اللہ اپنی اصل توجہ کامرکز و محور پہلی قسم کے مسائل ہی کو بتائے گی۔ اس لیے بھی کہ فی الواقع وہی اساسی اور بنیادی ہیں اور اس لیے بھی کہ موجودہ دور کے فقہوں کی زور دراصل ان ہی پر پڑ رہی ہے، یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، اور ایمان بالآخرت ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں لہذا اس وقت اہل ضرورت ان کے استحکام کی ہے، اور ان کے معاملے میں کسی قسم کی رواداری اور مہانت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ دعوت میں نرمی اور حکمت تبلیغ بالکل دوسری چیز ہے اور مہانت فی الدین بالکل دوسری، ان معاملات میں مصلحت کی بنا پر رواداری ممکن نہیں ہے۔ البتہ تیسری قسم کے مسائل میں تشدد اور غلو کسی طرح جائز نہیں ہے۔ ان میں بھی مذاکرہ اور باہمی تبادلہ خیال ہو سکتا ہے لیکن کسی ایک رائے یا مسلک کو بالجبر دوسروں پر ٹھونسناسی صورت میں درست نہیں۔ ہم اپنی اجتماعیت میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جس میں ان اختلافی مسائل کے بارے میں انتہائی رواداری اور فراخ دلی پائی جاسکے۔

چھٹی خصوصیت جو قرارداد میں صراحت کے ساتھ مذکور ہو چکی ہے یہ ہے کہ اس میں "الْأَهْلُ فَأَلَا هُمْ" کا اصول پیش نظر رکھا جائے گا اور تبلیغ و دعوت میں تدریج ملحوظ رہے گی۔ یہ تمام معاملات احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بصراحت مذکور ہیں۔ ساتویں خصوصیت اس اجتماعیت کی جیسا کہ قرارداد سے واضح ہے یہ ہوگی کہ اس کا دائرہ کار صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ غیر مسلم بھی اس کے مخاطب ہوں گے۔ مسلمانوں کی خامیوں کی اصلاح بھی ہمارے فرائض دینی میں شامل ہے اور غیر مسلموں تک اسلام کی تبلیغ اور ان پر رسالت محمدی علی صاحبہ السلام کی جانب سے اتمام حجت بھی ہماری دینی ذمہ داریوں میں سے ہے ہماری یہ اسلامی تنظیم انشاء اللہ اس ضمن میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوشاں ہوگی۔

پیش نظر تنظیم کی مذکورہ بالا خصوصیات تو وہ ہیں جو ہمارے مابین متفق علیہ ہیں اور ہماری قرارداد میں صراحتاً یا دلالتاً مذکور ہیں۔ اب میں بعض ایسی خصوصیات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو

میری ذاتی رائے میں ہمیں اختیار کرنی چاہئیں۔ ان میں اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن مجھے امید ہے کہ ان میں سے اکثر کو آپ حضرات اپنے دل ہی کی آواز محسوس کریں گے۔

ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہمیں اذکار و ادراد کے معاملے میں یہ اصول متعین کر لینا چاہیے کہ ہم ادراد و وظائف اور اذکار و ادعیہ میں سے صرف ان کو اختیار کریں جو خدا کی کتاب یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ماخوذ ہوں ان کا اولین فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہم خدا اور رسول کے ساتھ بڑے رہیں گے اور اس سے یقیناً ایک عظیم روحانی فائدہ ہوگا، اس کے ساتھ ہی اس سے افراتق و انتشار میں بھی کمی ہوگی۔ مختلف لوگ اپنے ذوق کے اعتبار سے مختلف اذکار اختیار کر لیں تو رفتہ رفتہ یہی ان کی ماہ الامتیاز خصوصیت بن جاتے ہیں اور اس سے ایک علیحدگی کا احساس پیدا ہو سکتا ہے لہذا اس اعتبار سے بھی عافیت اسی میں ہے کہ صرف سنون و آثار ادعیہ و اذکار پر اکتفا کیا جائے۔

دوسری یہ کہ مثبت اور منفی دونوں کام سامنے رکھے جائیں۔ دین میں معروف کے امر کے ساتھ منکر کی بھی کامی حکم دیا گیا ہے اور احقاق حق کے ساتھ ابطالِ باطل کو بھی لازم ٹھہرایا گیا ہے، اہل جو علم خیال پھیل گیا ہے کہ صرف مثبت کام کرنا چاہیے منفی کام نہیں کرنا چاہیے تو یہ میری ذاتی رائے میں از روئے دین درست نہیں ہے۔ دعوت کا اچھے سے اچھا اسلوب اختیار کرنا اور حکمتِ تبلیغ کو پیش نظر رکھنا بالکل دوسری بات ہے اور انکارِ منکر اور ابطالِ باطل سے قطعاً صرف نظر کر کے صرف مثبت باتوں کو پیش کرتے رہنا بالکل دوسری چیز ہے اور دینی غیرت و محبت کا لازمی تقاضا میرے نزدیک یہ ہے کہ خلافِ دین و شرع امور پر برکتا تنقید کی جائے، چاہے اس کا ہدف اصحابِ اقتدار بنتے ہوں چاہے عوام اس معاملے میں یہ پہلو بھی لائقِ توجہ ہے کہ آج کل حکومت کی خلافِ مذہب باتوں پر تنقید کرنے والے تو پھر بھی مل جاتے ہیں، عوام کو ان کی خلافِ دین باتوں پر ٹوکنے والا کوئی نہیں رہا جبکہ میری ذاتی رائے میں آج کے زمانے میں عوام کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کبھی سلطانین و امرا کو حال تھی اور اس اعتبار سے ان کی نظری و عملی گراہیوں اور ضلالتوں پر تنقید بھی "افضل الجہاد" کے حکم میں داخل ہو گئی ہے۔

تیسرے یہ کہ جاہلیتِ قدیمہ اور جاہلیتِ جدیدہ دونوں کا ابطال کیا جائے۔ یہ تو ہو سکتا ہے بلکہ غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جاہلیتِ قدیمہ کی بیخ کنی کی صلاحیت و قدرت سے مسلح ہوں اور کچھ دوسرے لوگ جاہلیتِ جدیدہ کے امتیصال کی قدرت و طاقت رکھیں چنانچہ انہیں اپنے اپنے محاذوں پر کام کرنا ہوگا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں محاذ پیش نظر ہیں اور کسی سے صرف نظر نہ ہونے پائے۔

چوتھی کوشش پیش نظر تنظیمِ اسلامی میں اس امر کی ہونی چاہیے کہ نہ تو زری عقلیت پر نصاب کیا جائے اور نہ ہی زری جذباتیت پر دار و مدار ہو بلکہ عقل اور جذبے دونوں کو مناسب مقام پر رکھ کر کام کیا جائے جو بات کہی جائے وہ صرف عقلی ہی نہ ہو بلکہ دل سے بھی نکلے تاکہ اس کے مخاطب اہل عقل بھی ہوں اور صاحبانِ دل بھی۔ اور دعوتِ خود اہل عقل کے بھی دل میں گھر کر جائے! پانچویں لازمی چیز جس کا پورا اہتمام ہماری اس تنظیم میں کیا جانا چاہیے یہ ہے کہ اس میں تنقید پر کوئی پہرہ نہ لگایا جائے اور ایسی کوئی پابندی نہ لگائی جائے جس سے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں۔ تنقید کے صحیح اسلامی آداب کی پابندی تو یقیناً لازم ہے لیکن تنقید کے دروازوں کو بند کر دینا پیش نظر تنظیم کی پیشگی ہلاکت کا سامان ہوگا۔ اس تنظیم کے اربابِ حل و عقد کا تنقید کو برداشت کرنے کی ہمت و صلاحیت سے مسلح ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے کہ پیش نظر تنظیم کا نظام شورائی ہو اور قرآنِ حکیم کی اس ہدایت کہ: **وَأْمُرْهُمْ شُرُؤًا بَيْنَهُمْ** کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔

چھٹی خصوصیت ہماری اجتماعیت کی یہ ہونی چاہیے کہ اس میں زہد خشک اور تفریح بے قید کے مابین درمیانی کیفیت پیدا ہو اور نہ تو عبوساً قہمطراً کالغشہ پیدا ہو جائے، نہ دوسری انتہا ہو کہ ہر وقت ہنسی دل لگی اور تفریح کا ماحول طاری رہے۔

اسی طرح 'رہبانیت' اور 'تنعم' کے مابین درمیانی کیفیت کا پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ دین میں نہ قطعی ترکِ لذت کی ترغیب ہے اور نہ عیش پرستی کی گنجائش ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے جائز طریقے سے متمتع ہونے کو برا سمجھنا بھی دین کی روح کے منافی ہے اور عیشِ کوشی بھی از روئے دین ممنوع ہے۔

ساتویں ضروری چیز جو قرار داد کی توضیح میں بہت وضاحت کے ساتھ آچھی یہ ہے کہ انتظامی اور تنظیمی امور میں دلچسپی کے ساتھ اسی درجہ کا گہرا شغف تعبدی امور میں ہونا لازمی ہے ورنہ بالکل یک رخئی شخصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی بدولت دینی تنظیموں میں بہت سی خرابیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ پیش نظر تنظیم میں ان شاء اللہ اس امر کی خصوصی نگہداشت کی جائے گی۔

اٹھویں اور آخری ضروری چیز یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مخصوص فنون کا صحیح فہم اور ان کی اہمیت کا صحیح شعور حاصل کیا جائے۔ اس معاملے میں دین کے خادموں کو بالکل ماہر تشخیص طبیب کے مانند ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے اپنے زمانے کی اصل اور بنیادی بیماریوں کی صحیح تشخیص کر سکیں۔ بصورت دیگر یہ ہو سکتا ہے اور لبا اوقات ہوتا ہے کہ ساری جدوجہد عطلات کے خلاف ہوتی رہتی ہے۔ اور بیماری کی اصل جڑ جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہ حقیقت بین نے بالکل صحیح اندازہ کر لیا تھا کہ منیع زکوٰۃ وغیرہ جیسے بظاہر 'فروعی' معاملات کی تہ میں اصل مرض کون سا کام کر رہا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کی نگاہ دور رس نے بھی اپنے وقت کے فتنے کا صحیح صحیح اندازہ کر لیا تھا پھر ان کے بعد بھی تمام مجددین اپنے اپنے دور کے فتنوں کی اہمیت کا اندازہ کر کے ان کے سدباب کی سعی کرتے رہے، فجزاھم اللہ خیر الجزاء عن جمیع المسلمین۔ اپنے وقت کے امراض کی صحیح تشخیص کے لیے بڑی گہری بصیرت کی ضرورت ہے اور یہ چیز درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے ہوتی ہے۔ تاہم اپنے مقدور جہر اس امر کی سعی ضروری ہے کہ کسی ایک ہی پٹی ہوئی راہ پر چلتے رہنے کے بجائے اس پرسلسل غور و فکر اور تفکر و تدبر کیا جاتا ہے کہ ہمارے زمانے کے اصل فتنے کون سے ہیں اور ان کے سدباب کی صحیح راہ کون سی ہے۔

آخر میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر کے اپنی معروضات کو ختم کرتا ہوں کہ جو کام کرنے کا عزم ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کیا ہے وہ بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی، آسان اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے دین کا تقاضا، ہماری فطرت کی پکار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے پروردگار کی جانب سے عائد کردہ فرض ہے۔ لہذا اس کی ادائیگی کی سعی و جہد سے دلوں کو راحت اور قلوب کو اطمینان و سکون حاصل ہوگا۔ - - - اور مشکل اس اعتبار سے کہ

بسا اوقات اس راہ کی مسلسل جدوجہد کا کوئی محسوس نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آتا اور انسان کو کمال صبر و استقامت کے ساتھ اپنی محنت کے نتائج و ثمرات سے بالکل بے نیاز ہو کر کام کیے جانا پڑتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ "اے علی! اگر اللہ تیرے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت کی راہ پر لے آئے تو یہ تیرے لیے سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے! بس یہی اس راہ کے ہر مسافر کا ماٹو (Motto) ہونا چاہیے اور اگر اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک فرد بشر کو بھی سیدھی راہ پر لے آئے تو اسے چاہیے کہ اس بات کو واقعہً ایک دولت بلکہ بہا اور نعمت غیر مترقبہ تصور کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمارے قلب و نظر کی کیفیت فی الواقع یہ نہ ہو جائے تو اس راہ میں ثابت قدم رہنا محال ہے۔

آخر میں میں اپنے اور آپ کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہدایت و استقامت اور عفو و مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

مولانا اصلاحی کا الوداعی خطاب

عزیزاً تقویٰ!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرار داد پر اتفاق کر لیا۔ میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لیے عزم و ہمت عطا فرمائے، اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے۔ میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت اور اہمیت مجھ پر واضح تھی، لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قومی اضعیف ہو رہے ہیں، کوئی بھاری بوجھ اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے اس آخری دور کے لیے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کر لیا تھا، اب وقتِ فرصت کا لحاظ اس پر صرف کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ باؤ کے باوجود میں خود اس

کے لیے پل کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کمی اس فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا، لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر چمک کر کے ان کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام ترویجی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں، تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو بھی فریضہ عائد ہوتا ہے، اس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے، جس کے سبب نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں، بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا، جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہر حال اب میں پورے شرح صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہو رہا ہوں اور ان تمام دوستوں کا دل سے شکر گزار رہی جنہوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا، ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میرے ذمہ اس وقت آپ تمام شرکائے مجلس کو بعض ضروری ہدایات دینے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ یہ ہدایات ان کاموں سے متعلق ہیں جو آپ کو یہاں سے رخصت ہونے کے بعد کرنے ہیں، براہ کرم ان کو نوٹ کر لیجئے۔

جماعتی تنظیم سے متعلق اس وقت آپ کو پہلا کام یہ کرنا ہے کہ تنظیم کے نظام دستور سے متعلق آپ کے سامنے جو تجویزیں ہیں، وہ مقامی رفقہ سے مشورہ کے بعد رقم بند کر کے شیخ سلطان احمد صاحب کے پاس بھیج دیجئے تاکہ مجلس شہادت اٹن سے فائدہ اٹھا سکے۔

حتی الوسع اس بات کی کوشش کیجئے کہ تجاویز کے بارے میں اگر اختلاف راستے ہو تو وہ غرور بحث سے مقامی رفقہ ہی کے اندر طے ہو جائے، تاکہ آگے کا کام آسان ہو جائے۔ اگر غرور بحث کے بعد بھی کسی امر میں اختلاف باقی رہ جائے تو اس کو نوٹ کر دیا جائے۔

اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح و تربیت سے متعلق جو کام آپ کو کرنے ہیں ان کے بارے میں مفصل ہدایات تو افرادی قوت کا جائزہ لینے کے بعد ہی دی جا سکیں گی، لیکن چند کام ایسے ابتدائی اور بدیہی نوعیت کے ہیں کہ ان کا اہتمام بلا تاخیر آپ کو کرنا چاہیے۔

پہلا کام نماز کا اہتمام ہے۔ نماز ہمارے دین میں ایمان کا اولین تقاضا ہے۔ قرآن عظیم

سے یہ بات ثابت ہے کہ اسلامی تنظیم کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام نے اصلاح و تربیت کا پہلا قدم اسی سے اٹھایا ہے۔ آپ بھی اس کی پابندی کے لیے مضبوط عہد کیجئے اور اپنے عزیزوں، قریبوں، دوستوں، پڑوسیوں اور محلداروں کو بھی دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کی تلقین کیجئے۔ نماز کے اہتمام میں یہ بات بھی داخل ہے کہ حشی الوسخ محلہ کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کیجئے بغیر کسی محتول عذر کے اس میں کوتاہی نہ کیجئے اور دوسروں کو بھی نماز باجماعت کی عظمت و اہمیت سمجھانے کی کوشش کیجئے!!

دوسرا کام یہ ہے کہ اپنے دینی علم میں اضافہ کا اہتمام کیجئے۔ جن مقامات پر یہ ممکن ہو کہ کسی ذی علم کی رہنمائی میں قرآن مجید کا اجتماعی مطالعہ کیا جاسکے، وہاں حلقہ تدبیر قرآن قائم کیجئے اور ہفتہ میں کم از کم ایک دن اس کام کے لیے خاص کیجئے کہ کچھ وقت قرآن کے فہم و مطالعہ میں بسر ہو۔ اس کے ساتھ اگر حدیث کی ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جائے جو اخلاقی احادیث پر مشتمل ہیں مثلاً ریاض القاضین وغیرہ تو اس سے مزید خیر و برکت ہوگی۔ اگر کسی ذی علم کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو عام حلقہ مطالعہ اسلامی قائم کیجئے اور منتخب اسلامی کتب کا التزام سے مطالعہ کیجئے۔ اس قسم کے حلقوں میں اپنے ان دینی بھائیوں کو بھی شرکت کی دعوت دیجئے جن کے اندر دین اور علم دین کی رغبت محسوس کریں۔

آپ لوگوں میں سے جن لوگوں نے جدید تعلیم پائی ہو، ان کو میں یہ مشورہ بھی دوں گا کہ وہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش کریں، تاکہ وہ قرآن و حدیث سے براہ راست استفادہ کر سکیں۔ بظاہر یہ کام مشکل نظر آتا ہے لیکن شوق اور طلب سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اپنے اپنے شہروں میں جس عالم سے بھی اس کام میں آپ کو مدد ملنے کی توقع ہو اس سے استفادہ کیجئے۔ ہم خود بھی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس مسئلہ پر غور کریں گے کہ آسان طریقہ سے آپ کو عربی سیکھانے کی کیا شکل اختیار کی جاسکتی ہے۔ لاہور میں اس سلسلہ میں ہم نے جو تجربے کیے ہیں، ہم ان سے بھی آپ کو آگاہ کریں گے تاکہ جن مقامات پر اس پہنچ پر درس جاری ہو سکے وہاں اس پہنچ پر درس جاری کیے جائیں۔

تیسرا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے مقامات پر اپنے ہم خیال اور رفیق تلاش کیجئے جن کے

تعاون سے پیش نظر مقصد کو تقویت حاصل ہو۔ جو اس جدوجہد میں آپ کے لیے سہارا بن سکیں، جو آپ کی اصلاح کریں، اور جن کی آپ اصلاح کریں۔ جماعتی زندگی کی یہی خیر و برکت ہے جو انفرادی زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ یہ زمانہ بہت بڑا ہے لیکن اس بڑے زمانے میں بھی اچھی رُو میں اور نیک نفوس موجود ہیں، ضرورت ٹٹولنے اور جستجو کی ہے۔ جب آپ جستجو کریں گے تو اللہ کے بے شمار بندے ایسے مل جائیں گے جو آپ کی رفاقت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کتنے نفوس ہوتے ہیں جن کے اندر دینی حش موجود ہوتی ہے، لیکن کوئی اس کو اُکسانے والا نہیں ہوتا، اس وجہ سے وہ دبی رہتی ہے۔ آپ ایسے نفوس تلاش کیجئے، اُن تک پہنچئے، اُن سے تبادلہ خیالات کیجئے اور اس کام میں اُن کو تعاون کی دعوت دیجئے۔

آپ کی اجتماعی طاقت جتنی ہی بڑھتی جائے گی اتنی ہی ان کاموں کی انجام دہی آپ کے لیے آسان ہوتی جائے گی جو افراد اور معاشرہ کی اصلاح سے متعلق آپ پیش نظر رکھتے ہیں۔

یہ چند ابتدائی کام ہیں جو اس قرارداد کی روشنی میں جو آپ نے پاس کی ہے، فی الفور شروع کیے جاسکتے ہیں۔ آگے اللہ مزید کاموں کی راہیں کھولے گا، اگر ہمارے اندر اس کے دین کی خدمت کے لیے اخلاص ہوگا۔ اب دعا کیجئے کہ ہمیں اس کام کے لیے سچا عزم حاصل ہو اور ہر قدم پر توفیق الہی ہماری رہنمائی فرمائے!

تائید و تبصرہ

۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم

ایک نیا اصلاحی ادارہ

لاہور کے ایک معزز دینی ماہر، شیخان سے یہ معلوم کر کے بلی غوشی ہوئی کہ وہاں چند ذی فہم و بصیرت مخلصوں کی سعی و اہتمام سے ایک نئے دینی ادارہ کی بنیاد بالکل صحیح اصول پر پڑ رہی ہے۔ یہ حضرات زیادہ تر جماعت اسلامی سے نکلے ہوئے ارکان ہیں اور یقین ہے کہ یہ انشاء اللہ ان غلطیوں سے محفوظ رہیں گے جن کا خوب تجربہ انہیں جماعت مذکورہ میں شامل رہ کر ہو چکا ہے۔ ادارہ کے ایک بانی مولانا امین آسن اصلاحی کی یہ بات آپ زور سے لکھنے کے قابل ہے :

مجماعتیں تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصل کسی اعلیٰ درجہ نصب العین کے لیے لیکن قائم ہو جانے کے بعد وہ رفتہ رفتہ از خود نصب العین اور مقصدین جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے!

یہ صدق کے مسک کی صد فی صد ترجمانی ہے۔ مولانا اصلاحی کی تقریر کا یہ کچھ بھی ضروری اہمیت کا حامل ہے :

مرد باپ اقتدار کی ہر اہمیت کو ہٹ تنقید بنا لینا، یہاں تک کہ ان کے خیر کو بھی شتر قرار دے لینا اور اس کی مخالفت میں اس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی برائیاں بھی ان کے کھاتے میں ڈال دینا، عقل و منطق کی رو سے جائز ہے اور نہ اسلام کی رو سے۔ یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے!

اور پاکستان کی دہندوستان کی نہیں جماعت اسلامی کو شدید ترین نقصان شاید اسی چیز نے پہنچایا ہے۔ اللہ ہم کو کچھ غلطیوں سے سبق لینے کی توفیق دے اور راہ اصلاح و ہدایت مستقیم رکھے۔

خدمتِ دین کی گنجائشیں

”پاکستان کے دینی ماہنامہ ’مِثاق‘ لاہور سے نئی دینی و اجتماعی تنظیم کے سلسلے میں: ’ہمیں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیش نظر تنظیم ہرگز ’الجماعت‘ کے حکم میں داخل نہ ہوگی۔‘ الجماعت ’کا مقام ہماری دانست میں اُمتِ مسلمہ کی بحیثیتِ مجموعی حاصل ہے۔ دین کی خدمت ایک نہایت وسیع و عریض کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہی ہیں اور ان شاء اللہ ان کے ساتھ ہمارا روزِ تعاون و تائید ہی کا ہوگا؟

بات اصلاً بہت موٹی اور بالکل صاف و واضح ہے، لیکن اس زمانے میں بہت بڑی بات ہے۔ دین و اُمت کی خدمت کے استخرا ہوئیں اور خدمت کے لیے گنجائش اتنی ہے کہ اگر نفسانیت کو چھوڑ کر تھوڑے سے بھی عزم و حوصلہ کے ساتھ خدمت کا ارادہ ہو تو خلوص اور فہمِ سلیم سے کام لینے والا ہر فرد اُمت اس کے اندر کھپ سکتا ہے اور باہمی مناقشہ سے جواب تک بڑا سبک راہ بنا ہوا ہے۔ نجات پا کر ہر گروہ اپنے مذاق و استعداد کے لحاظ سے سچا خادمِ دین بن سکتا ہے! (مِثاق - لاہور، جنوری ۱۹۶۸ء بحوالہ ’مصدقِ جدید‘، ۷ نومبر ۱۹۶۸ء)

۲۔ مولانا عبد الباری ندویؒ

فرنگی ساخت کی جماعت سازی اور اُس کی فتنہ سامانی!

”تازہ ’مِثاق‘ میں زیادہ تر پرانی جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے حضرات جو ایک نئی جماعت بنا رہے ہیں اور جس کا ہمارے حضرت صاحبِ ’مصدق‘ نے بھی خیر مقدم کیا ہے، اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ آپ کی تقریر کی جس بات کی صاحبِ ’مصدق‘ نے داؤدی نہیں، میں بھی اُسے ہی سب سے زیادہ قابلِ داؤد اور آپ زکر کیا، آپ جو لہر سے کھنے کے قابل پاتا

ہوں۔ میں تو فرنگی ساخت کی جماعت سازوں کے عین خیر ہی میں اس فساد کو داخل جانتا ہوں اور علی الاعلان کہا کرتا ہوں کہ یہ افتراق سازی کی بنیاد ہوتی ہے۔ انبیاء کا طریق یہ ہے کہ صاحب دعوت و عزیمت اپنی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے اور پلاکی مصنوعی جماعت سازی کے جو لوگ برضا و رغبت اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، بس وہی "حزب اللہ" بن جاتے ہیں اور قواعد و ضوابط اور کثرت رائے وغیرہ کی بحث کے بغیر جب تک وہ داعی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں سبھی تک خیریت رہتی ہے۔ باقی جہاں اقلیت و اکثریت وغیرہ کی رائے شماری اور صدور و سیکرٹری اور چندہ بازی وغیرہ کے جدید فرنگی طریقے داخل ہوتے، بس پھوٹ لیتی ہے کہ ایسی صورت میں جیسا آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے (بالکل نفسیاتی طور پر) جماعت مقصود بن جاتی ہے اور اصل مقصود غائب ہوتے ہوتے بمنزلہ صفر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب تک غیر معمولی اخلاص و لہجیت کم و بیش تمام افراد جماعت میں نہ ہوں، جماعتی عصیت قائم اس جماعت سازی کا لازمہ ہے۔ مجھے تو ہمیشہ الہ آباد کے عارف اکبر کا یہ عارفانہ شعر برابر یاد آتا رہتا ہے، جس کے ذریعے اس طرز کی جماعت سازوں کے آغاز ہی میں انہوں نے آگاہ فرمادیا تھا:۔

کر یا بہ بنشائے برحل بندہ کہ ہستم اسیر کیٹی و چنبدہ!
 اد یہ سراپا ناکارہ ... اور ... کے حضرات سے یہی عرض کرتا رہتا ہے کہ اپنی
 جماعتوں کو توڑ دیں کہ ان میں سے انجام کسی ایک کا بھی بخیر نہیں ہوا ... میں جب آخر تک
 کوئی صدارت سے کنارہ کش ہونے سے راضی نہ ہوا تو بالآخر صدارت کو دو صدروں میں تقسیم
 کرنا پڑا! (مولانا اصلاحی کے نام ایک خط سے ماخوذ)

حصه دوم

عقائد

یا نبیادی دینی تصورات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ظہیم اسلامی کے بنیادی دینی تصورات — یعنی عقائد — اہل سنت
و الجماعت کے مطابق ہیں، جن کی رُو سے: ہر عاقل و بالغ مسلمان خواہ وہ مرد ہو یا عورت
پر لازم ہے کہ وہ:

۱: پورے شعور و ادراک کے ساتھ اقرار کرے کہ:
اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاسْمَائِهِ وَصِفَاتِهِ وَقَبِلْتُ جَمِيعَ اَحْكَامِهِ
اِقْرَأُ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيقٌ بِالْقَلْبِ یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر
جیسا کہ وہ اپنے اسماء و صفات سے ظاہر ہے اور قبول کرتا ہوں اس کے جملہ
احکام، اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے! — اور
اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلِكْتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَالْقَدْرِ حَقِيْرٍ وَشَرِّهِ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ
یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر، اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر،
اور اس کے رسولوں پر، اور لیم آخر پر، اور تقدیر پر کہ اس کی بھلائی اور بُرائی سب
اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر۔

تشریح: اسلام کی اساس ایمان پر قائم ہے اور ایمان کی تعبیر کے لیے ایمانِ عمل اور
ایمانِ منقل کے مندرجہ بالا الفاظ جو سلف سے منقول ہیں احمد درجہ موزوں بھی ہیں اور نہایت جامع و
ماتج بھی۔ اس لیے کہ ان میں ایمانیات کی تفصیل کے علاوہ دو اہم اور بنیادی سمجھتے بھی واضح ہو جاتے
ہیں: ایک یہ کہ ایمان زبانی اقرار جو اس قانونی ایمان یعنی اسلام کا کرنِ اولین ہے جس پر تمام ذہنی
معاملات کا دار و مدار ہے اور جس پر اسلامی ہیئتِ اجتماعی کی بنیاد قائم ہوتی ہے، اور تصدیقِ قلبی جس
پر اس حقیقی ایمان کا دار و مدار ہے جس کی بنا پر آخرت میں کوئی شخص مومن قرار پائے گا، دونوں کا مجموعہ
ہے اور دوسرے یہ کہ علمی و نظری اور اصرولی اعتبار سے ایمان حقیقتاً ایمان باللہ ہی کا نام ہے۔
بقیہ تمام ایمانیات اسی اصل کی فروع اور اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔ چنانچہ ایمان بالآخرت بھی اللہ تعالیٰ
کی صفاتِ حکمت و عدل ہی کا مظہر ہے اور ایمان بالمراسلت بھی اس کی صفاتِ ربوبیت و ہدایت

ہی کی توحید۔

اللہ وہ زندہ جاوید ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ الْأَحَدُ ہے یعنی ہر اعتبار سے تنہا اور ایلا، چنانچہ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں نہ حقوق میں نہ اختیارات میں، نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے نہ ہم کفو، نہ ہم سر ہے نہ ہم پیر، نہ ضد ہے نہ ضد، نہ مثل ہے نہ مثال۔۔۔۔۔ وہ الصَّمَدُ ہے یعنی وہ پورے سلسلہ کون و مکان کا مبدع بھی ہے اور موجود بھی، خالق بھی ہے اور باری بھی، صلح بھی ہے اور مصدق بھی، اور اسی کی توجہ و عنایت اسے تحائف ہوتے بھی ہے اور قائم کیے ہوئے بھی۔

وہ پاک اور منزہ و متبرجہ ہے عیب، نقص، ہر کمی، ہر ضعف، ہر احتیاج، ہر غلطی اور ہر کوتاہی سے، گویا وہ 'مُسْتَبْرَح' بھی ہے اور 'القُدُّوس' بھی۔۔۔۔۔ اور جامع ہے تمام محاسن و کمالات کا، اور ہر خیر اور خوبی کا بدرجہ تمام و کمال، گویا وہ 'الغنی' بھی ہے اور 'الحمید' بھی، کسی کو کوئی قوت و طاقت حاصل نہیں بجز اس کے، اذن و اجازت کے، گویا وہ 'العلی' بھی ہے اور 'العظیم' بھی اور 'المتعال' بھی ہے اور 'الکبیر'، 'المتکبر' بھی۔۔۔۔۔ سُبْحَانَ اللَّهِ

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

اس کی ذات و لام الراء ثم وراء الراء ہے اور اس کی ماہیت اور کتبہ کو کوئی نہیں جان سکتا اور اس کی معرفت کی واحد راہ اس کے اسماء و صفات کے واسطے ہی سے ہے چنانچہ تمام اچھے

نام اسی کے ہیں اگرچہ متعین طور پر اس کے اسماء حسنی وہی ہیں جو قرآن اور حدیث نبوی میں وارد ہوئے۔۔۔۔۔ اسی طرح وہ تمام صفات کمال سے تمام و کمال شصت ہے جن میں سے اہم ترین آٹھ ہیں یعنی حیات، علم، قدرت، ارادہ، سب، بصر، کلام اور تکوین، چنانچہ وہی 'الہی' بھی ہے اور 'القیوم' بھی اور 'السمیع' بھی ہے اور 'البصیر' بھی، 'عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ' بھی ہے

اور 'يَكُلُّ شَيْءًا عَالِمٌ' بھی، 'فَقَالَ لِمَا يُرِيدُ' بھی ہے اور 'إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ' کی شان کا حامل بھی۔۔۔۔۔ مزید یہاں اس کی جملہ صفات اس کی ذات

ہی کے ساندہ مطلق و لامتناہی ہیں نہ کہ محدود و مقید، اور قدیم ہیں نہ کہ حادث، اور ذاتی ہیں نہ کہ کسی اور کی عطا کردہ۔

فرشتے وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نور سے تخلیق فرمایا۔ وہ صاحبِ لطف و رحمت کے حامل ہیں نہ کہ مجرد قوائے طبعیہ، ان کا نہ ذکر ہونا معلوم ہے نہ موت، وہ خدا سے قرب فرزند رکھتے ہیں لیکن الٰہیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، وہ اللہ کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم انہیں بلکہ خداوندی سے ملے، وہ اللہ کے احکام کی تنفیذ بھی کرتے ہیں اور خالق و مخلوق کے مابین پیغامِ برسانی بھی، چنانچہ وہی انبیاء و رسل تک وحی لاتے رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے لیکن چار بہت مشہور بھی ہیں اور جلیل القدر بھی یعنی حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسماعیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام۔

اللہ کی کتابوں میں سے بھی چار ہی معلوم و معروف ہیں، یعنی توراہ جو حضرت موسیٰ کو عطا ہوئی اور زبور جو حضرت داؤد کو عطا ہوئی اور انجیل جو حضرت عیسیٰ کو عطا ہوئی اور قرآن جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا، یہ اللہ کی آخری کتاب اور نوعِ انسانی کے نام اللہ کا آخری اور مکمل پیغام ہے، جس کے بعد کوئی اور کتاب نازل نہ ہوگی اور جوین و عن محفوظ موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا جبکہ باقی تینوں کتابیں رد و بدل اور تغیر و تحریف کا ہدف بن چکی ہیں، گویا اب قرآن ہی ان کا مَصَدِّق ہے، صحاح و تفسیر میں بھی — ان کے علاوہ اور بھی بہت سے پیغمبروں کو صحیفے عطا ہوئے جن میں سے کچھ اب دنیا میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، باقی محرف اور مبتل ہیں۔

اللہ کے رسولِ نوعِ انسانی کے وہ برگزیدہ افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم تک پہنچانے کے لیے وقتاً فوقتاً چنا اور پسند فرمایا۔ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے اور سب گھلا سے پاک یعنی مصوم تھے، ان کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے، قرآن مجید میں جن کے نام مذکور ہیں ان کے سوائے کسی اور کو یقین کے ساتھ نبی یا رسول قرار نہیں دیا جاسکتا، ان میں سے پانچ حد درجہ اولادِ ہریم اور نہایت عالی مرتبہ ہیں یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم — ان میں سے بعض کو بعض پر ضربا پہلو قتل سے جزوی بخشیت حاصل ہے لیکن جملہ انبیاء و رسلِ بخشیت مکی سید ولدِ آدم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے جو قائم النبیین بھی ہیں اور آخر الرسل بھی اور جن کے بعد وحی نبوت کا دروازہ بند ہے۔

انبیاء و رسل کی تائید و تقویت کے لیے اللہ تعالیٰ عام آدمی کو ضابطہ کو عارضی طور پر مصلیٰ کر کے گویا عادی قانون کو توڑ کر اپنی آیات ظاہر کرتا اور معجزات دکھاتا رہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بے شمار حسی معجزے عطا ہوئے لیکن آپ کا اہم ترین اور عظیم ترین معجزہ معنوی ہے یعنی قرآن مجید۔

یومِ آخر وہ دن ہے جس میں تمام انسان دوبارہ زندہ ہو کر عدالتِ خداوندی میں محاسبے اور جزا و سزا کے فیصلے کے لیے پیش ہوں گے جس کے نتیجے میں یا جنت میں داخل ہو گا یا جہنم میں۔ اس دن اقتدارِ مطلق اور اختیارِ کلی صرف اللہ واحد و قہار کے ہاتھ میں ہو گا۔ نہ کسی کو کسی جانب سے کوئی مدد مل سکے گی، نہ کوئی کچھ دے دلا کر چھوٹ سکے گا، نہ کوئی سفارش ہی خدا کی پڑ سے بچا سکے گی۔ انبیاء و رسل، صلحاء و افتیاء، ملائکہ و ارواح اور سب سے بڑھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتبِ عالیہ کے اظہار و اعلان اور ان کے اعزاز و اکرام کے لیے شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور گناہ گار اہل ایمان کے حق میں ان کی شفاعت قبول بھی ہوگی لیکن نہ وہ خدا کی مرضی اور منشا کے خلاف کچھ کہیں گے اور نہ ہی خدا کی صفتِ عدلِ باطل ہوگی۔

تقدیر کے خیر و شر کا من جانب اللہ ہونا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے اور مخلوقات میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ بغیر اس کی اجازت محض اپنے ارادے سے کچھ کر سکے لہذا یہاں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے، خواہ وہ کسی کو بھلا لگے یا برا، اللہ کے اذن ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو خدا کا عاجز و لاچار ہونا لازم آتا ہے۔ مزید برآں، وہ عَالِمُ مَکَانَ وَ مَا بَیْنَهُمْ بھی ہے۔ چنانچہ اس پورے سلسلہ کون در مکان میں جو کچھ ماضی میں ہوا، یا حال میں ہو رہا ہے یا مستقبل میں ہو گا سب اس کے علمِ قدیم میں پہلے سے موجود ہے، اگرچہ اس کا یہ علم جبر محض کو تسلیم نہیں۔ گویا ایمان بالقدر، در اصل اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی قدرت اور علم کے مضمرات اور مقتدرات ہی کو کہتے ہیں۔

بعثت بعد الموت سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو گا تو فرشتوں کی ہولناکیوں کے نتیجے میں کائنات کا پورا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور سب پر ایک عمومی موت طاری ہو جائے گی پھر جب اللہ کا اذن ہو گا تو فرشتے مائیم ہو گا اور سب جی اٹھیں گے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر

تاقیام قیامت پیدا ہونے والے آخری انسان تک سب میدانِ حشر میں جمع کیے جائیں گے۔

ب: کَلِمَاتٍ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ کے جملہ مضمرات و مقدمات کے فہم و شعور کے ساتھ گواہی دے کر:

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ

تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔

تشریح: اس شہادت کے جزو اول کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان

جو کچھ آسمان و زمین میں ہے سب کا خالق، پروردگار، مالک اور بحیثیتِ حاکم صرف اللہ ہے۔ ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ گویا "أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ" اور "لَهُ الْعُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ"۔

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ:

۱- انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی و کار ساز حاجت روا اور شکل کشا، فریاد رس اور حامی و ناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہے ہی نہیں۔

۲- اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے امیدیں والبت نہ کرے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک تنہا ہی اللہ ہے۔

۳- اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو دوسرے کے لیے نہ پکارے، کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش خصائص اور

کوٹال سکتی ہو، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں، خواہ فرشتے ہوں یا پھر

یا اولیاء۔

۴- اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے

اور کسی کے ساتھ وہ حاملہ نہ کرے بلکہ شکر میں اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے اللہ

کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

- ۵- اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ تسلیم نہ کرے کسی کو با اختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت اور اُس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں، کیونکہ اپنے حکم کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو ملکیت اور مالکیت کا حق نہیں ہے نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:
- ۶- انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دست بردار ہو جائے، اپنی خواہش نفس کی بندگی چھوڑ دے اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔
- ۷- اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک، مختار نہ سمجھے، بلکہ ہر چیز حقیقی کہ اپنی جان، اپنے اعضاء اور اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اور اس کی طرف سے امانت سمجھے۔
- ۸- اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اُسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔
- ۹- اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔
- ۱۰- اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی تمام سعی و جہد کا مقصد اور اپنی فوری زندگی کا محور بنائے۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی اس کا محبوب حقیقی اور مطلوب و مقصود اصلی بن جائے۔
- ۱۱- اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، ہیئت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے اور ہر اُس طریقے اور ضابطے کو رد کر دے جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو۔
- اس شہادت کے جزو ثانی سے واضح ہوتا ہے کہ سید و ولد آدم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اللہ کے بندے ہیں اور دوسرے یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پہلی حیثیت کے اعتبار سے آپ عہدیت کا ملکہ کے مقام پر فائز ہیں اور آپ کی اس حیثیت کے علم اور اعتراف سے شرک کی ان جملہ اقسام کا کامل سدباب ہو جاتا ہے جن میں سابقہ امتیں اپنے

اپنے انبیاء و رسل کے فرود احترام، شدت عقیدت اور غور محبت کے باعث طوٹ پھوٹتے ہوئے اور دور دوری حیثیت کے اعتبار سے آپ کے فرق مبارک پر ختم نبوت اور ختم رسالت کا تاج بھی ہے اور آپ کے دست مبارک میں شہنشاہ ارض و سما کی جانب سے اتمام نعمت و شریعت اور تکمیل نبی صحتی کا فرمان شاہی بھی۔ گویا سلطان کائنات کی طرف سے رونے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبی کے ذریعہ سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کیا گیا، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امر واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان کو عمل مخلوقات میں شدید ترین محبت ان حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو اور آپ کی اطاعت اور اتباع ہی زندگی کا اصل طریق بن جائے گا:

- ۱- انسان ہر اس تعلیم اور ہر اس ہدایت کو بلے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔
- ۲- اس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسول خدا سے ثابت ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری دلیل پر اس کی اطاعت موقوف نہ ہو۔
- ۳- رسول خدا کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی اور رہنمائی تسلیم نہ کرے۔ دوسرے انسانوں کی پیشوائی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے تحت ہو، نہ کہ ان سے آزاد۔
- ۴- اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو محبت اور صدا اور مرجع قرار دے، جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے، جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے، اور جو سنت ہی حل طلب ہو اسے حل کرنے کے لیے اسی سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔
- ۵- تمام مصیبتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی، یا قبائلی و نسلی، یا قومی و وطنی، یا فرقی و گروہی۔ کسی کی محبت یا عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسول خدا کے احکام سے ہونے سن کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آجائے یا اس کی برعکس بن جائے۔
- ۶- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کو نہ تو کسی بھی معنی میں نبی یا رسول

کچھ مضموم اور یہی کسی کا یہ نصب اور ترتیب کچھ کہ اس کے ماننے پر انسان کا مومن و مسلم سمجھا جانا منحصر ہو۔

نیز اسی کے تعترفات کی حیثیت سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

۷- یہ تسلیم کیا جائے کہ آپ نے جو نظام قائم فرمایا اور جو خلافت راشدہ کے دوران تمام کمال قائم رہا، وہی 'دین حق' اور 'نظام اسلامی' کی صحیح ترین اور واحد سادہ تعبیر ہے۔ گویا خلافت راشدہ فی الواقع 'خلافت علی منہاج النبوة' یعنی اور خلفائے اربعہ یعنی حضرات ابراہیمؑ، عیسیٰؑ، محمدؐ اور فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور علیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و انصار ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ خلفائے راشدین و مہدیین ہیں جن کی سنت انصھور کے بعد دین میں حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

۸- یہ یقین رکھا جائے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جنہیں انصھور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کی تعلیم اور تزکیہ و تربیت سے براہ راست فیضیاب ہونے کی سعادت نصیب ہوتی من حیث الجماعت پوری اہمیت میں افضلیت مطلقہ کے حامل ہیں۔ جیسی کہ کوئی غیر صحابی کسی صحابی سے افضل نہیں ہو سکتا۔ ان کی محبت جزو ایمان ہے۔ ان کی تعظیم و توقیر و اصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر ہے اور ان سے بغض و عدوت اور ان کی تحقیر و توہین در حقیقت انصھور سے بغض و عدوت اور آپ کی تحقیر و توہین ہے۔ ان کے اہلین جزوی فضیلت کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں لیکن فضیلت کلی متعین طور پر اس طرح ہے کہ تمام صحابہ میں ایک اضافی درجہ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب بیعت رضوان کو، پھر ان پر ایک مزید درجہ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب بدکوہ پھر ان پر ایک اور درجہ فضیلت کے حامل ہیں حضرات عشرہ مبشرہ اور ان میں فضیلت مطلقہ حاصل ہے حضرات خلفاء اربعہ کو جن کی افضلیت علی ترتیب خلافت ہے یعنی افضل البشر بعد الانبیاء۔ بالیقین ہیں حضرت ابراہیمؑ، محمدؐ، پھر وہ ہے حضرت عمر فاروقؓ کا، پھر تمام ہے حضرت عثمان غنیؓ کا اور پھر مرتبہ ہے حضرت علیؓ کا!

مزید بآں صحابہ کرام کل کے کل متصل ہیں اور ان کے اہلین اختلاف نزاع نفسانیت کی بنا پر نہیں بلکہ خطائے اجتہادی کی بنا پر ہوا۔ چنانچہ مشاہرات صحابہ کے باب میں عماد تاریخ پیش

تیرے کہ "کُفِّ لِسَانِ" سے کام لیا جائے اور کامل سکوت اختیار کیا جائے تاہم کوئی حقیقی اور واقعی ضرورت ہی لائق ہو جائے تو ایک کو "مُصِيبٌ" یعنی صحیح موقف پر اور دوسرے کو "مُخْطِئٌ" یعنی راہِ خطائے اجتہادی پر تقرر دیا جاسکتا ہے لیکن کسی کو بھی سب و تمام الزام و اہام کا ہفت بنانا جائز نہیں ہے!

ج: ہر قسم کے کفر اور جملہ انواع و اقسامِ شرک اور تمام ردائل و فہمِ اخلاق

سے شعوری طور پر اعلانِ برائت کرے یا اس الفاظ کو:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ أَشْرِكَ بِكَ شَيْئًا وَ إِنَّا أَعْلَمُ بِهِ
وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا أَعْلَمُ بِهِ نَبَتْ عَنْهُ وَتَبَرَّأْتُ مِنْ
الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ وَالْكَذِبِ وَالْغَيْبَةِ وَالْبِدْعَةِ وَاللَّيْمَةِ
وَالْفَوَاحِشِ وَالْبُهْتَانِ وَالْمَعَاصِي كُلِّهَا۔

یعنی "اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیرے ساتھ کسی کو جانتے بوجھے شریک کروں اور تجھ سے مغفرت کا طلب گزار ہوں اگر کبھی بلے سبھے بوجھے ایسا ہو جائے اور میں اعلانِ برائت کرتا ہوں ہر نوع کے کفر سے، شرک سے، جھوٹ سے، غیبت سے، بدعت سے، چغنی خوری سے، بلے حیاتی کے کاموں سے، بہتان طرازی سے

اور جملہ نافرمانیوں سے۔"

تشریح: ایسا کی طرح کفر کی بھی دو قسمیں ہیں ایک کفر حقیقی یا کفر قلبی اور دوسرے کفر قانونی یا کفر ظاہری۔ کفر حقیقی یا کفر قلبی کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقہ ریزہ بخوری اور اس کی ہر مصیبت اور نافرمانی پر ہو جاتا ہے لیکن جہاں تک اس کفر قانونی یا کفر شرعی کا تعلق ہے جس کی بندہ پر کسی کی تکلیف کر کے اس کا ارتکاب امت اسلامی سے منقطع کر دیا جائے تو وہ ضروریاتِ دین میں سے کسی کے احکام ہی سے لازم آتا ہے، مجبوراً عملی یا نافرمانی حسی کہ کبائر کے ارتکاب سے بھی لازم نہیں آتا۔

اسی طرح شرک کی بھی بے شمار اقسام ہیں مثلاً بعض شرک اعتقادی ہیں مادہ بعض صرف عملی

بعض علی ہیں اور بعض خفی، تاہم جملہ انواع و اقسام شرک کا ایک احصاء اور احاطہ اس طرح ممکن ہے کہ ایک شرک فی الذات ہے یعنی یہ کہ کسی کو کسی اعتبار سے خدا کا ہم جنس، یا ہم کعبہ بنا دیا جائے جس کا کامل رد ہے سورۃ اخلاص میں۔ دوسرے شرک فی الصفات ہے یعنی کسی کو کسی صفت کے اعتبار سے خدا کا مثل یا مثل بنا دیا جائے جس کا نہایت مکمل سد باب ہے آیت الکرسی میں اور تیسرے شرک فی الحقوق ہے جس کی جامع ترین تعبیر شرک فی العبادت ہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی خدا سے بڑھ کر یا اس جتنا مجرب و مطلوب ہو جائے اور یہ بھی کہ کسی کو غسلی الاطلاق مطاع مان لیا جائے یعنی اس کی اطاعت خدا کی اطاعت سے آزاد تسلیم کر لی جائے، اور یہ بھی کہ عام ہادی قانون اور ظاہری قواعد و ضوابط کے دائرے سے باہر کسی سے استعانت اور استمداد و استعاذہ کیا جائے یا اس سے دعا کی جائے اور اسے پکارا جائے (عام ہادی قوانین کے تحت بھی اگر کسی کے بارے میں یہ خیال ہو کہ شخص اپنی قوت اور ارادے سے کسی کو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہے تو یہ شرک فی الصفات کی ایک قسم یعنی شرک فی القدرت اور شرک فی التقرّف ہوگا) مزید برآں شرک کی اسی نوع کے ذیل میں آتے ہیں ریاء اور سمجھی اور کسی کے لیے کسی بھی نیت سے ان مراسم عبودیت کو جالانا بھی جو صرف اللہ کے لیے خاص ہیں جیسے سجدہ اور نذر!

رذائل و ذنوب اخلاق کی مکمل فہرست دینا ممکن نہیں۔ تاہم اگر انسان ان سے اجتناب کرے جو اوپر بیان ہوئے تو دوسروں کا سدباب خود بخود ہو جائے گا!

۵: سابقہ زندگی کے تمام گناہوں پر نہایت الحاح و زاری سے بارگاہِ خداوندی میں مغفرت کا طلب گار ہو اور آئندہ کے لیے کامل غلوص و اخلاص کے ساتھ توبہ کرے، ان الفاظ کے ساتھ کہ:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُهُ عَمَدًا اَوْ حَصَاً
سِرًّا اَوْ عَلَانِيَةً وَاَنْتُوْبُ اِلَيْهِ مِنْ الذَّنْبِ الَّذِيْ اَعْلَمُ
وَمِنْ الذَّنْبِ الَّذِيْ لَوْ اَعْلَمْتُ اَنَّكَ اَنْتَ عَلَمُ الْعِيُوْبِ وَسَتَارُ
الْعِيُوْبِ وَعَقَارُ الذَّنُوْبِ۔

یعنی میں اللہ سے معافی کا خواستگار ہوں تمام گناہوں پر خواہ میں نے جان

بوجھ کر کیے ہوں یا بغیر ارادہی طور پر، اور خواہ چھپ چھپا کر کیے ہوں خواہ علانیہ طور پر، اور خواہ وہ میرے علم میں ہوں خواہ میرے علم میں نہ ہوں۔ اے اللہ تو ہی تمام غیبوں کا جاننے والا اور تمام غیبوں کی پردہ پوشی کرنے والا اور تمام گناہوں کی بخشش فرمانے والا ہے!

فشنیج: توبہ صرف زبان سے کلمات توبہ کے ادا کر دینے یا ان کے درو یا وظیفہ بنالینے کا نام نہیں ہے بلکہ گناہ پر حقیقی ندامت اور واقعی پشیمانی اور مصیبت سے کلی اعتنا ب کے عزم مصمم کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں رجوع کرنے اور گناہ و مصیبت کو بالفعل ترک کر دینے کا نام ہے۔ تین شرائط ان کو تا ہیوں کے ضمن میں کافی ہیں جو حقوق اللہ کے باب میں ہوں حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے محاسنی کے لیے ایک پوچھی اضانی شرط یہ ہے کہ جس کسی پر زیادتی ہوتی ہو اس کی تلافی کی جائے یا اس سے معافی حاصل کی جائے۔

بنابریں توبہ کی صحت کے لیے لازم ہے کہ شخص تنظیم اسلامی میں شمولیت کا خواہاں ہو جو: ۱۔ مجلہ فرائض دینی کی پابندی اختیار کرے اور تمام کبار سے فی الفور مجتنب ہو جائے۔ ۲۔ ارکانِ اسلام کی پوری پابندی کرے۔ چنانچہ نماز قائم کرے (مردوں کے لیے التزام جماعت بھی ضروری ہے) رمضان المبارک کے روزے رکھے، صاحب نصاب ہو تو باقاعدہ حساب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرے۔ اور صاحب استطاعت ہو اور تا حال حج بیت اللہ نہ کیا ہو تو فوراً نیت کرے اور جلد از جلد فریضہ حج ادا کرے۔

۲۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ سے زیادہ اتباع کرے اور ایسی تمام بدعات اور رذالت کو ترک کر دے جن کا ثبوت قرونِ شہود لہا بغیر میں نہ ملتا ہو۔

فشنیج: ان بدعات و رسومات کا زیادہ زور شادی بیاہ، پیدائش، عقیقہ، ختنہ، ساگرہ، فوتیگی اور تیراوں کے مواقع پر ہوتا ہے ان سب میں لازم ہو گا کہ اپنے معاملات کو زیادہ سے زیادہ قرونِ اولیٰ کے مطابق بنایا جائے اور بعد کے اضافوں کو ترک کر دیا جائے۔

۳۔ اپنی معاشرت میں جملہ اسلامی احکام کی پابندی کرنے خصوصاً ستر اور حجاب کے شرعی احکام پر عمل پیرا ہو۔

۴۔ اگر کوئی ایسا ذریعہ معاش رکھتا ہو جو مصیبتِ فاحشہ کے ذیل میں آتا ہو جیسے چوری، ڈاکہ، سودا، شراب، قرض و سود، شہادت زور و رشوت، خیانت، بجا اور نہ و غیرہ تو اسے ترک کر دے۔

تشریح، اس بات کا تو بظاہر احوال کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ لوگ تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کے خواہاں ہوں جن کی معاش چوری یا ڈاکہ، شراب کی تیاری یا اس کی فروخت وغیرہ، عصمتِ فردوشی یا قرض و سود ایسے قبیح کاموں سے متعلق ہوں تاہم اگر اللہ تعالیٰ ایسے کسی کاروبار سے متعلق کسی فرد کو اصلاح کی توفیق دے تو یہ بھی اس کی رحمت سے بعید نہیں۔ بہر صورت ان تمام کاموں کی حرمت اور قباحت و شناعیت ہمارے معاشرے میں معلوم و معروف ہے۔ البتہ بعض حرام چیزیں کچھ اس طرح ہمارے معاشرے میں جاری و ساری ہو گئی ہیں کہ عام لوگ یا تو ان کی قباحت سے ہی آگاہ نہیں رہے یا انہوں نے کسی مجبوری کے مندر کی بنیاد پر ان کو اپنے لیے مباح کر لیا ہے۔ ان میں سے سزاوار ترین چیز ہے سود، جس سے بلذاتاً پھر ان حکیم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلانِ جنگ کی وعید سناتا ہے اور دوسرے نمبر پر ہے رشوت اور سرکاری حیثیت اور اختیار کا ناجائز استعمال اور ان پرستندہ ہیں بیع و شرا کی بعض ناجائز صورتیں اور سرکاری محاصل (ڈامنگ، ٹیکس، ڈیوٹی وغیرہ) سے بچنے کے لیے اخفا و کذب بیانی۔

ہمیں خوب اندازہ ہے کہ اس وقت جو خداناشناس اور عاقبت نا آشنا نظام پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور پورا انسانی معاشرہ بحیثیتِ مجرّمی جس فسادِ اخلاقی میں مبتلا ہے اس کے پیش نظر ان تمام چیزوں سے کامل اجتناب نہایت مشکل اور صبرِ آزما کام ہے لیکن تنظیمِ اسلامی جن مقاصد کے لیے قائم کی جا رہی ہے اس کے پیش نظر لازم ہے کہ اس سے عملی وابستگی کے لیے وہی لوگ آگے بڑھیں جو رخصتوں اور حیلوں پر عمل کرنے کے بجائے عزیمت اور صبر و توکل کو اپنا شعار بنائیں اور ہر اس ذریعہ معاش کو ترک کرنے کی کوشش کریں جس میں حرام کی آمیزش ہو۔ اس معاملے میں سردست حسب ذیل تصریحات پر اکتفا کی جاتی ہے:

(۱) سود لینا اور دینا قطعاً حرام ہیں لہذا بھجوں یا دیگر اداروں سے نہ کسی کوئی رقم کسی بھی غرض کے لیے سڈو قرض لینا جائز ہے نہ سیونگ، اکاؤنٹ یا گسٹڈ ڈیپازٹ یا نقد رقم پر حقہ منافع کی کسی بھی دوسری صورت میں سرمایہ لگانا درست ہے۔ چنانچہ بھجوں سے صرف عام سود پر حقہ ترسیل

زیرا لاکرز سے انتفاع یا زیادہ سے زیادہ کرنٹ اکاؤنٹ رکھنے کی سہولت حاصل کی جاسکتی ہے۔
 (ii) کسی ایسے کاروباری ادارے کی ملازمت جائز نہیں ہے جس میں سود کو غالب عنصر کی حیثیت حاصل ہو جیسے بینک اور انشورنس کمپنیاں۔

(iii) رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔ البتہ کسی ایسی صورت میں کہ کسی ظالم اہل کار یا صاحب اختیار کو اپنا جائز حق وصول کرنے کے لیے کچھ مجبوراً دینا پڑے تو اس کا شمار استحصال بالجبر میں ہوگا رشوت میں نہیں۔ البتہ یہ صرف اسی صورت میں ہوگا کہ کوئی ناجائز انتفاع مطلوب ہو، کسی سرکاری قانون اور پابندی سے بچنا مقصود ہو اور نہ ہی کسی اور کے جائز حقوق پر زور دہتی ہو۔

(iv) سرکاری محاصل کے ضمن میں جتنی رعایتیں مروجہ قانون کے اندر اندر ممکن ہوں ان سے بڑھ کر کسی ایسی صورت کو اختیار کرنا درست نہیں ہے جس میں کذب، فریب اور شہادت زور شامل ہوں۔
 (v) کاروبار کی مختلف صورتوں میں سے بھی جن جن میں بیح فاسد یا جوئے یا شے یا احتکار وغیرہ کا عنصر شامل ہو اس سے بچنا لازم ہے۔

(vi) اگر اس کے قبضے میں ایسٹال یا جائداد ہو جو حرام طریقے سے آیا ہو یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دستبردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے۔ البتہ یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا لازم ہے جب کہ حق دار بھی معلوم ہوں اور وہ مال بھی معلوم و متعین ہو جس میں ان کا حق تلف ہوا ہے۔ بصورت دیگر تو بہ اور آئندہ کے لیے طرز عمل کی اصلاح کافی ہوگی۔

ہد: گہرے احساس ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرے کہ وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف اللہ کا ہو کر رہے گا، رضائے الہی ہی اس کا اصل مقصود و مطلوب ہوگی اور نجات و فلاح آخروی کا حصول ہی اس کا اصل نصب العین ہوگا۔ اور جس طرح اس کی نماز اور قربانی صرف اللہ کے لیے ہوگی اسی طرح اس کے سبب و جان، مال و منال حتیٰ کہ زندگی اور موت سب اللہ ہی کے لیے ہوں گے۔ یعنی

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيفًا وَمَا

قَاتِلِينَ الشُّرُكِيِّنَ ۝ — اِه — اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ
وَمَمَاتِي شُورَتِ الْعَالَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهٗ ۝ وَبِذَلِكَ اَمَرْتُ وَ
اَنَا اَكُوْلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

تفسیر صحیح: ہمدردی شیعہ مسلمان کا زمین فرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت سے مرشارہر کہ
اپنی پوری زندگی اس کی کمال اطاعت میں دیدے (جو لازماً اطاعتِ رسولؐ ہی کے واسطے سے
ہوگی)؛ اسی رویے کے نام عبادتِ رب سے جو ہر انسان سے اللہ کا پہلا مطالبہ ہے اور جس کی
طرف نوری انسانی کو دعوت دینے کے لیے تمام انبیاء و رسل مبعوث ہوئے اور جواز دئے قرآن
جنوں اور انسانوں کا عین مقصد تخلیق ہے اس کے ساتھ ہی اس پر لازم ہے کہ اپنی محنت و قوت
فرصت و فراغت، صلاحیت و استعداد، مال و دولت، اور وسائل و ذرائع کا زیادہ سے زیادہ حصہ
تو اسی بالحق اور تو اسی بالصبر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل، دعوت
الی اللہ اور تبلیغِ دین، نصرتِ خدا و رسولؐ اور حمایت و اقامتِ دین اور شہادتِ حق علی الناس اور
اظہارِ دینِ حق علی الدین کلمہ کے لیے وقف کر دے اور اس کے لیے محنت و مشقت، انفاق
ایشیاء، ترک و اختیار، ابتلا و آزمائش، صبر و مصابرت، استقامت و مقاومت — الغرض ہجرت
اور جہاد فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل کے لیے مقدمہ ہجرت و عزیمت کی راہ اختیار کرے یہ
تمام فرائض ہر مسلمان پر حسب صلاحیت و استعداد اور مطابق وسعت و قوت عاید ہوتے ہیں اور
ان کی انجام دہی میں ہی بندے کی وفاداری کا اصل امتحان ہے!

و: خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے اور اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا کے
پیش نظر پورے احساسِ مسئولیت کے ساتھ عہد کرے کہ اپنے فرائضِ دینی
کی انجام دہی کے لیے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کہ
اَنَا اَمْرُكُمْ بِنَجْمِیْنَ ۝ بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّلَعَةِ وَالْهَجْرَةِ
وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ کے مطابق تنظیمِ اسلامی کے نظم کی پوری پابندی
کرسکے گا۔

تفسیر صحیح: یہ بات اہمی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ تنظیمِ اسلامی نہ عام معنی میں ذمیری یا سیاسی محبت

ہے نہ محدود مفہوم میں نہ ہی عظیم بلکہ یہ ایک ہر گیر دینی جماعت ہے لہذا اگرچہ یہ خیال کرنا تو غلطی ہی نہیں
 عظیم گمراہی ہوگی کہ یہ اس جماعت کے حکم میں ہے جس میں شریعت اسلام میں داخلے اور جس سے علیحدگی
 کفر کے مترادف ہے اور جس کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مَنْ شَكَّ
 شَكَّ فِي الشَّارِعِ یعنی جو اس سے علیحدہ ہو گا وہ علیحدہ ہی جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ تاہم
 اس کے نظم کو عام معاشرتی و ثقافتی انجمنوں یا طبقاتی و پیشہ ورانہ تنظیموں یا سیاسی و قومی جماعتوں کے قواعد و
 ضوابط کی پابندی پر بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کی اطاعت فی المعروف "سمیع و طاعت"
 کے خاص اسلامی اور عقیدت دینی اصول کے مطابق تمام شرکائے تنظیم پر واجب ہے۔

وَعَنْ

عِبَادَةِ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ

قَالَ: بَايَعَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ
 عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ

فِي السُّرِّ وَالنُّسْرِ

وَالْمَنْشُطِ وَالْمَكْرُ

وَعَلَى آثَرِهِ عَلَيْنَا

وَأَنَّ لَأَنْتَانِ عِ الْأَمْرَ أَمَلَةً، إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَ كُفْرٍ

مِنْ اللَّهِ فِيهِ بَرْهَانٌ،

وَعَلَى أَنْ تَقُولَ بِالْحَقِّ إِنَّمَا كُنَّا، لِأَنْتَانِ فِي اللَّهِ

(بخاری و مسلم)

لَوْعَةً لَا يَنْبَغُ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام نظامِ خلافت کا قیام



تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت ہے نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک

اسلامی انقلابی جماعت ہے

جو اولاً پاکستان میں اور بالآخر ساری دنیا میں دینِ حق یعنی

اسلام کو غالب یا بالفاظِ دیگر نظامِ خلافت

قائم کرے گا